جوشیات پر مشتمل ایک عالمی جریدہ

غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کی جانب سے منعقد عالمی جوش سیمینار میں 'جوش بانی' کی اجراء کا ایک منظر

دائیں سے بائیں: اقبال حیدر، اسد مفتی، ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ حسن ثانی نظامی، شاہد مہدی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر سید محمد عقیل، شاہد ماہلی، علی احمد فاطمی

جوش بانی - ۲

مرتبین

قمر رئیس

اقبال حیدر

مدیر

علی احمد فاطمی

معاونین

فخر الکریم

نعیم السحر

Josh Bani - 2 (Jul-Dec '08)

Published by : Josh Literary Society (India - Canada)

Price : Rs. 50.00 (India)
Rs. 100.00 (Pakistan)

مجلس مشاورت

جوش بانی-۲ جولائی تا دسمبر ۰۸ء

کتابت : شارپ ٹریک کمپیوٹرز، الہ آباد (shadabmz@rediffmail.com)

طباعت : ٹی آفسیٹ پریس، الہ آباد

سرورق : شاداب مسیح الزماں

قیمت : ۵۰ روپے (ہندوستان)، ۱۰۰ روپے (پاکستان)

پتہ : ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، انڈیا

+9910153058 (دہلی) +9415306239 (الہ آباد)

+(403) 2410834 (کنیڈا)

=========زیر اہتمام=========

جوش لٹریری سوسائٹی، انڈیا، کنیڈا

فہرست

اردو کے چند اہم رسالے

نیا ورق	ذہنِ جدید	ایوان اردو
مدیر	مدیر	نگراں
ساجد رشید	زبیر رضوی	قمر رئیس
ممبئی	دہلی	دہلی اردو اکادمی، دہلی

مباحثہ	نئی کتاب	کتاب نما
مدیر	مدیر	مدیر
وہاب اشرفی	شاہد علی خاں	ہمایوں ظفر زیدی
پٹنہ	دہلی	دہلی

اثبات	نئی صدی	انتساب
مدیر	مدیر	مدیر
اشعر نجمی	فرخ شاہد	سیفی سرانجی
ممبئی	بنارس	دہلی

سبق اردو	اردو ادب	فکر و تحقیق
مدیر	مدیر	مدیر
دانش الہ آبادی	اسلم پرویز	علی جاوید
الہ آباد	دہلی	دہلی

اردو رسالے خرید کر پڑھئے۔
یہ اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اداریہ

جوش بانی کا دوسرا شمارہ حاضر ہے۔

پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد ہمت افزائی اور مایوسی کے ملے جلے احساس کا تاثر قائم ہوا۔ ہمت افزائی ان معنوں میں کہ جو انصاف پسند ہیں اور جوش پسند بھی انھوں نے جوش بانی کو بغور ملاحظہ کیا، سراہا، خطوط لکھے اور اعتراف کیا کہ جوش بیسویں صدی میں اقبال کے بعد نظم کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اس بڑے شاعر کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ تھوڑی سی مایوسی اس بات کی ہوئی کہ جوش بانی کے تقریباً دو سو شمارے اعزازی طور پر پوری اردو دنیا میں روانہ کئے گئے۔ ضخیم شمارہ، ڈاک کے اخراجات اور بھی بہت کچھ۔ لیکن حلقہ کے بڑے حصے نے رسالہ کی وصولیابی کی رسید تک نہ بھیجی اور نہ ہی ایک ٹیلیفون یا ای میل۔ صرف علی گڑھ میں تقریباً ۲۵ اعزازی کاپیاں بھیجی گئیں لیکن ان میں سے صرف ایک خط سید امین اشرف کا آیا۔ علی گڑھ کی خاموشی یا مصلحت کی روایت تو بہت پرانی ہے، جوش کے حوالے سے یہ شہریوں بھی جوش مخالف اور جگر موافق رہا ہے۔ اس لئے بات سمجھ میں آتی ہے لیکن لکھنؤ جس پر جوش فدا تھے اور اسے فردوسِ شاعری کہتے تھے جب وہاں رسالے بھیجے گئے اور ترقی پسندوں کو بھیجے گئے لیکن وہاں کے لوگوں نے بھی کچھ تاثر نہ دیا۔۔۔ تو لکھنؤ سے متعلق انیس کی شکایت یاد آ گئی لیکن فیاض رفعت نے نمائندگی کی اسی طرح مغرب کی تنہا نمائندگی قیصر تمکین نے کی۔ ان دونوں کے خطوط آپ پڑھئے ان میں کس قدر جراُت اور صداقت ہے جواب اردو دنیا سے

رخصت ہو چکی ہے کیونکہ فی زمانہ بے با کی اور حق گوئی مصلحت آمیز خاموشی (Conspiracy of Silence) کا شکار ہو چکی ہے۔ ہم رائے دینے میں کنجوس اور تعریف کرنے میں تو مکھی چوس ہو چکے ہیں۔ زبان وادب کی کیا صورت حال ہے۔ انسان اور انسانیت کس طرح نرغے میں ہے اس کی کسی کو فکر نہیں۔ جوش اسی مُردنی، بے حسی کے خلاف تھے اور غصے میں کہتے تھے۔''نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں'' میرا خیال ہے یہ مصرعہ آج کے ماحول پر زیادہ صادق آتا ہے اور اس لئے جوش بھی آج کے ماحول اور مسائل کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ اور جوش بانی کا مقصد جوش کی اسی نو بہ نو مقصدیت اور افادیت کو تلاش کرنا ہے۔ آج صارفیت اور مادیت نے انسانی جذبات کا گلہ گھونٹ دیا ہے۔ عالم کاری نے آزادی اور تخلیقی اُپج پر قدغن لگائے ہیں۔ اخلاق وایثار بازار واد کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ ان متبدل صورتِ حال میں جوش کی شاعری، جمالیاتی اور ثقافتی دونوں زاویوں سے ایک نئی مقامیت اور تہذیب و ثقافت کے خوش رنگ اور خوش الحان پیغام سناتی ہے۔ مشینوں اور دہشتوں کی زد میں پستے ہوئے بشر کو بشریت کو للکارتی، انسانی عظمت، احترامِ آدمیت کے ترانے چھیڑتی ہے۔ تنقید و تحقیق کو آواز دیتی ہے کہ آج جوش کی مقصدیت اور افادیت کیا ہے۔

اس شمارہ میں جتنے مضامین شامل کئے گئے ہیں سب کہ سب نئے ہیں جو غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کے عالمی جوش سیمینار میں پڑھے گئے تھے اور اب ڈائریکٹر شاہد ماہلی کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ جوش بانی میں شاملِ اشاعت ہیں۔ سید محمد عقیل اور قمر رئیس ہمارے معتبر و بزرگ ترقی پسند نقاد ہیں لیکن ان کے مضامین ملاحظہ کیجئے ان میں ترقی پسندی کی نئی اپروچ اور تلاش نظر آئے گی۔ ان دونوں نے احتجاج، مزاحمت وغیرہ کو روایتی ڈگر سے ہٹ کر حالات حاضرہ اور نئی صورت حال کو ذہن میں رکھ کر جوش کی شاعری کی نئی فہم دی ہے۔ اسی طرح فضل امام رضوی کا مضمون اگر چہ مراثی سے تعلق رکھتا ہے لیکن اصل تلاش تو حقوق انسانی کی ہے جو ان دنوں معدوم ہو چلی ہے۔ لطف الرحمٰن کا مضمون روایتی سا ہے اور بحث طلب بھی۔ ان کے مضمون کی ابتداء اس خیال سے ہوتی ہے کہ جوش بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ یہ کتنا سچ ہے اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

اس شمارہ کا معرکہ کا مضمون اقبال حیدر کا ہے جو کئی اعتبار سے دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اقبال

حیدر کے مضامین کی یہ خوبی ہوا کرتی ہے کہ ان کا نقطۂ نظر گلوبل ہوتا ہے اور وہ وسیع تناظر میں موضوع کو جانچتے پرکھتے ہیں وہ جوش کی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن جن خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں عام طور پر آج کے نقاد یا تو سمجھ نہیں پاتے یا ارادی طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اقبال حیدر صحیح معنوں میں جوش شناس ہیں ان کا یہ مضمون جوش شناسی کی ایک اہم کڑی ہے۔

اسی شمارے کے دو اور مضامین بے حد اہم اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ عتیق اللہ اور ابو الکلام قاسمی کے مضامین۔ یہ ہمارے عہد کے معتبر و محترم نقاد ہیں۔ ان کی جوش شناسی ایک نئے فکری و تہذیبی ذائقہ سے روشناس کراتی ہے۔ عتیق اللہ نے زبان و بیان اور قاسمی نے یادوں کی برات کو بالکل جداگانہ انداز میں پرکھا اور پیش کیا ہے۔

شائستہ رضوی کا اپنا ایک تانیثی نقطۂ نظر ہے اور اس زاویہ سے وہ ادب کو جانچتی پرکھتی ہیں اور اس ضمن میں جوش کو بھی معاف نہیں کرتیں لیکن اس شمارہ میں شامل مضمون جوش کی محسوسات سے تعلق رکھتا ہے جسے شائستہ صاحبہ نے بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ فرید پربتی نے جوش کی رباعیوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جوش نے اس محدود و مشروط صنف کو لامحدود کر دیا ہے اور نئی جہتیں تلاش کی ہیں اور رباعی کو جدید نظم کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ وہ جوش کو اردو کا خیام کہتے ہیں۔ اسی طرح نوجوان لئیق رضوی نے جوش کے شخصی مرثیوں پر کارآمد گفتگو کی ہے۔

مضامین اور تھے لیکن ضخامت کی وجہ سے انھیں روکنا پڑا جسے ہم اگلے شمارے میں پیش کریں گے۔ اس درمیان ہماری گذارش پر حیدرآباد سے داؤد اشرف نے جوش اور حیدرآباد، غلام نبی خیال نے جوش اور کشمیر، ان کے علاوہ بیگ احساس، انور الدین، عصمت ملیح آبادی، شبنم حمید وغیرہ کے مضامین بھی ہیں جنھیں ہم اگلے شمارے میں شائع کریں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم جوش اور لکھنؤ اور جوش اور کراچی سے موضوعات پر بھی مضامین لکھوائیں۔ کوشش جاری ہے دیکھئے کون اس ذمہ داری کو نبھاتا ہے۔

حسب معمول جوش سے متعلق نئی کتابوں پر تبصرے ہیں لیکن اس بار ہم نے اردو کی چند نئی کتابوں پر تعارف و تبصرے بھی شامل کر دئے ہیں تا کہ ہمارے مغرب کے قارئین اردو کی نئی کتابوں سے واقف ہو سکیں۔

ہم ایم۔اے۔قدیر (الہ آباد) عبدالاحد ساز (ممبئی) اور انوار عباس (الہ آباد) کے شکر گذار ہیں جنھوں نے بڑی سنجیدگی سے جوش بانی کو شروع سے آخر تک پڑھا اور اپنے تفصیلی تاثرات سے نوازا۔ ہم ان سب کے تاثرات بھی شائع کر رہے ہیں۔ ہم ایک بار پھر کہنا چاہتے ہیں کہ جوش بانی کا مقصد۔ جوش کا بیجا پروپگنڈہ نہیں ہے بلکہ ایک بڑے عمدہ شاعر کو نئے سرے سے سمجھنا اور حال کی زندگی سے رشتہ جوڑتے ہوئے اسے نئے مقام و منصب پر لا کھڑا کرنا ہے۔ اس ضمن میں ہم اختلافی باتوں کو بھی شائع کرنے سے گریز نہیں کریں گے اور عمدہ وصحت مند قسم کی بحثوں کو چھیڑنے میں بھی پیچھے نہیں رہیں گے لیکن اس کے لئے ہمیں اپنی خاموشی توڑنی ہوگی۔ اور Culture of Silence کی جگہ Culture of Conversation پیدا کرنا ہوگا کی اسی سے زندگی نمو پاتی ہے اور ادب بھی۔ اس ضمن میں ہم ایسے مضامین یا ایسے مباحث کو شامل کریں گے جو براہ راست جوش کو نہ چھوتے ہوں لیکن فکرِ جوش یا تہذیبِ جوش سے کسی نہ کسی شکل میں ضرور وابستہ ہوں۔۔۔ ایسے مضامین یا نظموں کا استقبال رہے گا۔

-- علی احمد فاطمی

جوشؔ کی شاعری میں انقلاب، بغاوت اور ملیٹنسی

سید محمد عقیل

جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا جب جوشؔ صاحب الہ آباد میں ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم کے یہاں صبح صبح تشریف لائے۔ الہ آباد، وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اعجاز صاحب کے یہاں، نشور واحدیؔ، مجاز لکھنوی اور معین احسن جذبی صاحب پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ جوشؔ صاحب نے بیٹھتے ہی، اعجاز صاحب کو مخاطب کر کے ایک شعر داغ دیا:۔

جنگ جوئی ہے میری فطرت میں
آفریدی پٹھان ہوں پیارے

مشاعرے میں جگر صاحب سے کچھ نوک جھونک ہوگئی تھی۔ یہ اسی کا خمار تھا۔ اعجاز صاحب بولے بھئی ناشتہ تو پہلے کرلو، پھر جنگ بھی لڑیں گے۔ پھر جوشؔ صاحب نے اپنی نظم ''تلاشی'' گرجدار آواز میں پڑھنی شروع کی:

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آ، مرے دل کی تلاشی لے کہ برآئے مراد
جس کے اندر دہشتیں پر ہول طوفانوں کی ہیں
لرزہ افگن آندھیاں تیرہ بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں، اے دشمن ہندوستاں

شیر جس میں ہو نکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسرو اورنگ کی
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

یہ تخاطب انگریزی حکومت سے تھا۔ مگر ذرا رُکئے پہلے ایک بات اور کرتے ہیں۔ یہ اردو شاعری میں انقلاب، کا لفظ، سیاسی مقصد اور منطق کے ساتھ کب اور کیسے داخل ہوا؟ کیا جوشؔ سے پہلے کسی اور اردو کے شاعر نے یہ لفظ معہ اپنے سیاسی متعلقات اور سیاق کے بالعقد اِسے استعمال کیا تھا؟ اور پھر اپنی شعری فضا میں اس کو پھیلاتا چلا گیا؟ کم از کم راقم کو نہیں معلوم.. یہ بھی جاننا چاہیے کہ اقبالؔ نے سب سے پہلے اس لفظ 'انقلاب' کا استعمال اپنی فارسی شاعری میں اپنے مجموعۂ کلام ''زبور عجم'' میں انھیں معانی میں اور اسی تحرّک کے ساتھ کیا۔ زبور عجم ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ ان کی غزلوں کے اس مجموعے میں، اچانک یہ نظم نما شعری تخلیق بغیر کسی عنوان کے تیسویں نمبر پر چھپی ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

خواجہ، ازخونِ رگِ مزدور سازدلعل ناب
از جفائے دِہ خدایاں، کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب، انقلاب، اے انقلاب
میرو سلطاں نردباز و کعتبینِ شاں دَغل
جانِ محکوماں زتن بر دندو محکوماں بہ خواب
انقلاب، انقلاب، اے انقلاب
من، درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آں چناں زہرے کہ اَزوے کارہا در پیچ و تاب
انقلاب، انقلاب، اے انقلاب!

راقم کو صحیح سنہ اور تاریخ تو نہیں معلوم مگر شاید کم وبیش اسی وقت ہندوستان کی اس وقت کی ایک ترقی پسند سیاسی پارٹی، انڈین نیشنل کانگریس نے بھی ''انقلاب زندہ باد'' کا سیاسی نعرہ اپنایا تھا۔

جوشؔ کی شاعری کی ابتدا تو غزل سے ہوئی مگر ۱۹۱۸ء میں جب انھوں نے وطن نام کی نظم

لکھی، تو ان کی فکر میں احتجاج، بغاوت، انقلاب اور ملیٹنسی (جنگ جوئیت) کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ اگر چہ وطن پرستی کی لہر، اس وقت بھی اردو شاعری میں حاؔلی (حب وطن) چکبسؔت اور اقباؔل نیز دوسرے شعرا کے یہاں پیدا ہو چکی تھی۔ مگر جوؔش کے یہاں وطن کی محبت، تقریباً ایک متحارب جذبہ لے کر پیدا ہوتی ہے۔ جوؔش کی انقلابی اور ملیٹنسی کی شاعری پر باتیں کرتے ہوئے ان کے ان مصرعوں اور اشعار کو بطور خاص نظر میں رکھنا چاہیے۔

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

=======

اٹھو چونکو، بڑھو، منھ ہاتھ دھو، آنکھو کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے، ہندوستاں والو

=======

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

=======

ذکر ہوتا ہے مرا پرہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں، تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ

=======

پھر تیشۂ نو ہوا ہے وادی میں بلند
پھر جوؔش دھڑک رہا ہے کہسار کا دل

یہ تحرک اور اقدام کی عملی ترغیب کی صورت ہے جسے پروٹسٹ اور احتجاج و مزاحمت کا اگلا قدم سمجھنا چاہئے اور اسی ''ہاتھ میں تلوار'' اور ''تلواروں کی جھنکاروں'' کے ساتھ جوؔش کی انقلابی شاعری میں ملیٹنسی یعنی جنگ جوئیت شروع ہوتی ہے۔ یہاں جوؔش کی ایسی شاعری میں ایک واضح فرق پیدا ہوتا ہے یہ اس اردو شاعری سے جو رائج الوقت، وطن پرستی کی شاعری تھی جس میں ''یہاں سے دور جو

باطانیہ کی بستی ہے سنا ہے واں پہ محبت کی جنس سستی ہے‘‘ (پیبست)۔ یہ ایک طرح کی ’’جی حضوری‘‘، ’’مائی باپ‘‘ اور ’’دریوزہ گری‘‘ کی شاعری تھی جس کے مقابلے میں جوشؔ کی شاعری نے ایک للکار، مقابلے، چیلنج کی صورت، موضوع اور لہجے دونوں میں پیدا کی اور یہ کیفیت جوشؔ کی شاعری میں تصورات ار فکری عمل کے ساتھ پیدا ہوتی ہے جس کی بنیاد ایسے اشعار بناتے ہیں:

کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں لیتا ہے رہ رہ کر فضامیں انقلاب
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرے ذرے سے عیاں آثارِ حرب وجنگ ہیں
تیر جاتی ہے دل فولاد میں، میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
میں اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا ، گرجتا، گونجتا گاتا ہوا

اور یہ للکار، لہجہ اور چیلنج کی صورت صرف جوشؔ کے ساتھ ہی اردو شاعری میں داخل ہوتی ہے جس پر بعد کو، سردار جعفری، مخدوم، کیفی، اور مجروح وغیرہ اپنی انقلابی دیواریں مضبوط کرتے ہیں۔ یہ آواز بے دریغ ہے اور Cult of energy بھی اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے، جوشؔ کی، انقلاب کے لیے یہ اقدامی اور جرأت مندانہ جسارت بھی ہے۔ جوشؔ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان، انگریزوں کی قیدو بند سے چھوٹ جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کلونیلزم کی اندرونی بافت، بد نیتی، سامراجیت کی نیت کی کھوٹ کو سادہ لوحی سے آنک رہے تھے اور سامراجیت کے تمام وعدوں کو On the face of it سمجھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور جان گئے تھے کہ اس قید و بند کو توڑنے کے لیے عوام میں بیداری اور طاقت پیدا ہونی چاہیے فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی اور یہ اب ملیٹنسی کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔ محض احتجاج، پروٹسٹ اور نعرے بازیاں، کام نہیں آئیں گی تو جوشؔ للکار کر آواز دیتے ہیں:

میری آوازوں سے کانپ اٹھتا ہے روحوں کا سکوں

جذبۂ غیرت کی آنکھوں میں اتر آتا ہے خوں
شور اٹھتا ہے کہ محض اک وہم سے دارِ رسن
یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے یا خونی کفن

اور پھر جب آزادی مل جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو کہتے ہیں کہ

قسم اس جوشؔ کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

اپنی ایک نظم ''غلاموں سے خطاب'' میں کہتے ہیں:

توپیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے
اے امتِ شکستہ دل و اے گروہِ شل
کب سے بلا رہا ہوں میں تجھ کو سوئے عمل

تقریباً یہی صورت، ان کے اس وقت کے نثری مضامین میں بھی ملتی ہے۔ جو اسی وقت ان کے رسالے کلیم میں آگے پیچھے شائع ہو رہے تھے۔ ایک بات اور یہاں قابل غور ہے کہ کیا یہ جنگ جوئیت جوشؔ کی اپنی انفرادی سوچ ہے یا اس وقت یہ ملک کا اجتماعی مزاج بن رہا تھا۔ جواب اس کا 'ہاں' بھی ہے اور نہیں بھی۔ ہاں اس لئے کہ ایسی فکر، شاعری میں اس وقت، جوشؔ کی اپنی سوچ ہے۔ الفاظ کی تراش خراش، تلاش، جو جنگ جوئیت کے لئے اکسائیں، ترکیبوں کی ساخت اور ایسی شعری فضا بنانا جو ایک جنگی اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرے، سب جوشؔ کی انفرادی جہت اور جہد ہے جو ان کے موقف، یقین اور استقامت کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ یہاں تک تو جوشؔ کے لئے یہ بات صحیح ہے۔ 'نہیں' اس لیے کہ پورے ہندوستان کی فضا اور ماحول ہی ایک ایسے ہی ہیجان سے گزر رہے تھے۔ سیاسی طور پر انگریزوں کے خلاف، یہ ہیجان پورے ملک میں پیدا ہو گیا تھا۔ علی الخصوص 'جلیان والا' باغ کے بعد... اس صورت کی بلند چوٹیاں، نان کوآپریشن تحریک، خلافت کی تحریک، بھگت سنگھ کی پھانسی اور ایک سیاسی و جذباتی خلفشار کی صورت، سب مل کر ملک میں ایک انتشار پیدا کرتے ہیں۔

جس کا نقشہ جواہر لال نہرو کی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں یوں ملتا ہے۔

"MASS UPHEAVAL AND THEIR SUPRESSION"

(اجتماعی انتشار اور اس کی سرکوبی)

''نو اگست ۱۹۴۲ء کو علی الصباح متعدد گرفتاریاں، پورے ملک میں شروع ہوئیں۔ پھر کیا ہوا کہ ہفتوں بعد، ہم تک اخباروں کے کچھ تراشے بہم پہنچے۔ اور اب ہم، ان کی مدد سے صرف ایک نامکمل تصویر کا کچھ اندازہ کر سکے۔ یکا یک تمام اہم اور مشہور سیاسی لیڈر گرفتار کر کے موقع پر سے ہٹا دیئے گئے اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا اور یہ کہ اب ہمارا لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے اب تو صرف احتجاج ہی ہمارا راستہ رہ گیا تھا۔ اور احتجاج ہر طرف سے فوری طور پر ہوئے بھی۔ ان احتجاج کرنے والوں پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ آنسو گیس کے غبارے چھوڑے گئے اور عوام کے اس غم و غصے کے اظہار اور ان کی مشتہری کو حکومت نے سختی سے مسدود کر دیا اور ان پر پابندیاں لگا دی گئیں اور پھر لوگوں کے یہ تمام دبے ہوئے احتجاج اور اجتماعی جذبات یکا یک پھوٹ پڑے۔ تقریباً تمام شہروں اور دیہاتوں میں عوام کے ساتھ، پولیس اور فوج کا مقابلہ ہونے لگا۔ عوام بھی ان تمام ٹھکانوں پر حملہ آور ہوئے جو برٹش حکومت کے جبر کی علامتیں اور مستقر تھے یعنی پولیس اسٹیشن، پوسٹ آفس، ریلوے اسٹیشن وغیرہ۔ لوگوں نے ٹیلفون اور ٹیلیگراف کے تار کاٹ ڈالے دن بھر غیر مسلح عام لوگوں نے اسی طرح نہتے پن کے ساتھ، پولیس اور فوج کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ ان نہتے لوگوں پر حکومت نے نیچی اڑان والے ہوائی جہازوں اور فوج کے اسلحوں سے گولیاں برسائیں۔ تقریباً دو ماہ تک یہ عوامی بلوے کی صورت چلتی رہی۔''

(ڈسکوری آف انڈیا ۹۶۔۹۵ پیپر بیک اڈیشن۔ انگریزی سے ترجمہ بذریعۂ راقم۔)

توہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کے تخلیقی ادب میں، اجتماعی اور انقلابی ادب کی یہ صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں بنگالی، ہندی، پنجابی، اور اردو شاعری میں اس کی روشن مثالیں، قاضی نذرالاسلام کی نظمیں ''ودروہی (باغی) طوفان آگیا۔'' ''اے کہ رن باجا باجے گھن گھن'' (آگمن ترجمہ اختر رائے پوری) ''وہ دیکھو! نقارۂ جنگ پر چوٹ پڑی نونہال ہنستے ہوئے توپوں اور تلواروں پر گر پڑے اور انھیں اپنے معصوم خون سے چھینٹیں دینے لگے''۔ (نظم حاکم ومحکوم۔ ترجمہ اختر رائے پوری)۔ ''کہہ دے اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔ میں باغیوں کا سردار ہوں۔ خوں خواری سے میرا جی بھر گیا ہے۔ میں اسی دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں گونجے گی۔ .... دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اٹھا کر کھڑا ہوں (ترجمہ اختر رائے پوری۔ سم ۔ باغی (بدروہی) ہندی میں نرالا کی نظم بادل راگ اور 'جاگو تو ایک بار' اور پھر جوش ملیح آبادی، مخدوم، مجاز، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے انقلابی اور اجتماعی رویوں کا مطالعہ، ہندوستان کی سیاسی طور پر بدلتی ہوئی تصویر کی خاصی روشن مثالیں ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو میں ایک طرح کی اجتماعی صورت تو دبے دبے حسرت اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا کے یہاں وطن پرستی کی شکل میں دکھائی دیتی ہے جس کا دامن کانگریس کی نیشنل سیاست سے ''نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے'' کی قدرے تیکھی صورتوں تک موجود ہے مگر یہ ایک طرح کی گلو گرفتہ (SUBDUED) شکل ہے جو ترقی پسندوں کے ساتھ ہی، بلند آہنگ (Vocal) اور جسور ہو کر اٹھتی ہے جس میں سب سے بلند اور بے دھڑک آواز جوش ہی کی ہے۔ جوش کے اس وقت کے جونیر ہم نواؤں میں مجاز نے ۱۹۳۴ء میں اپنی نظم ''رات اور ریل'' میں علامتی ڈھنگ سے اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار یوں کیا کہ رات میں جو ریل چل رہی ہے یہ ایک طرح سے ہندوستان کی باغی روح ہے (لکھنؤ میں اپنی ٹیبل ٹاک میں مجاز اس کی وضاحت بھی کرتے تھے):

ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درآتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی ڈہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نوا کا خون کھولاتی ہوئی

تو شاعرآتش نوا کا خون کھولانے والی فضا اس وقت پورے ہندوستان میں موجود تھی اور اردو میں جوشؔ اس کے میر کارواں بن چکے تھے۔ تاہم جوشؔ، کانگریس کی مفاہمتی سیاست کے ساتھ نہ تھے بلکہ ان کا مزاج اور طبیعت کا انداز انقلابیوں کے ساتھ تھا جس کا عملی سربراہ بھگت سنگھ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں بھگت سنگھ کے پھانسی پر لٹکا دیئے جانے پر لاہور میں جو تعزیتی اجتماع ہوا تھا، جوش اس اجتماع میں شریک تھے اور جب یہیں، انھوں نے وہ قطعہ پڑھا:

سنو اے بستگانِ زلف گیتی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیات جاوداں سے

یہاں ''ندا'' کے لفظ پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ جوشؔ ''صدا'' کے بجائے ندا کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں تو پورے مجمعے پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور ظاہر ہے کہ بھگت سنگھ کے کارنامے کے لئے جوشؔ صاحب کا یہ زبردست نذرانۂ عقیدت تھا (راوی خود جوشؔ صاحب) پھر جوشؔ صاحب کی نظم شکست زنداں کا خواب اور

''اے جواں مردو، خدارا باندھ لو سر سے کفن
سر برہنہ پھر رہی ہے عزّتِ قوم ووطن
ہاں زمیں کو زیر کر کے آسمانوں پر چڑھو
ہاں بڑھو اے صف شکن ہیرو، بڑھو جلدی بڑھو

پاؤں میں تا چند زنجیر غلامی کی خراش
صرف اک جنبش، ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

یہ سب باتیں، جوشؔ صاحب کی ملیٹنسی کا اگلا قدم ہیں، جو عملی انقلاب کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اور جو حرکت اور عمل کا پیکر بن کر انقلابی بصیرت کے ساتھ، ملک کے حالات پر پھیلتا جاتا ہے۔ جوشؔ، ان اقدامات کو ہندوستان کی شخصیت میں ڈھال لینے کے خواہاں ہیں، جنھیں لوگ جوشؔ صاحب کی ملیٹنسی سے بے خبر صرف ان کا کھوکھلا نعرہ، یا اس وقت کے فیشن اور فارمولے کی شاعری یا محض ''ہاو ہو'' سمجھتے ہیں یا سمجھانا چاہتے ہیں جبکہ یہی ''مخادیم ادب'' انگریزی شعرا کی نظموں خصوصاً ٹینسن کی نظم ''چارج آف دی لائٹ بریگیڈ'' ساسون، (SYNGE) سینج اور بائرن کی کریمین جنگ پر لکھی ہوئی نظموں کو، انگریزی ادب کا شاہکار (ماسٹر پیس) مانتے ہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ جوشؔ کی ایسی فکر اور اقدام کی کوشش، انقلابی شاعری کی عملی ترغیب کی صورت بھی ہے۔ جو انقلابی دور کی انقلابی صورت حال سے پیدا ہوئی تھی اور جو اس وقت، ملک و قوم دونوں کے لیے ایک صحت مند اور لازمی صورت تھی اور جو اس وقت جوش کے جذبے اور ان کے ذہن کا مستحکم ایقان بن گئی۔ شاعری جب بھی کسی یقین محکم اور عصری آگہی کے ساتھ روح عصر کی تجذیب کر کے اپنی فکر اور کیفیت کا اظہار کرتی ہے، وہ کھوکھلی نعرہ بازی یا اشتہار بازی اور لمحاتی بازگشت نہیں ہوتی۔ جوشؔ کا عقیدہ تھا کہ ملک کی آزادی کی خواہش اور اس کی اقدامی صورتیں ہی ایک راستہ ہیں جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتی ہیں۔ یہ کوششیں بنیادی بھی ہیں اور مستحکم بھی۔

دیواروں کے نیچے آ آ کر، یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینے میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
سنبھلو کے وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

یہ اور اسی طرح کی متعدد شعری کوششیں اور صورتیں یقین محکم اور ملیٹنٹ (MILITANT)

اقدام، جذبے نیز حرکت اور عمل کے بغیر ممکن نہں ۔ یقیناً شاعر یا ادیب کی حساسیت، اسے ان حالات میں ڈوب جانے اور اسے عصری آگہی کا واقف کار بن جانے کی ترغیب دیتی رہتی ہے اور پھر ''خرید ارتو بن، ''جذب دروں'' اپنی فعالیت کو پھینٹ کر یہ نتیجے نکالتے ہیں:

یوں بھڑکنے سے رہا، شعلۂ عزم منصور / پہلے پروانۂ شمعِ رسن و دارتو بن /
قبضۂ یار میں رہنے کو اگر ہے بے چین / عرصۂ دہر میں چلتی ہوئی تلوار تو بن /
کھیل تو آگ سے بجلی کا خریدار تو بن / وغیرہ

کبھی متقین انقلاب اور انقلابی ادیبوں میں سے کسی نے غالباً برنارڈ شا یا چی گوآرا نے کہا تھا کہ انقلابی ادب بغیر انقلاب کے زیادہ دیر اور زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔ لیکن جوشؔ کا آزادی سے پہلے کا ہندوستان، اس قول کا مصداق نہیں کہ وہاں ہر ہر قدم پر، ایک جلیان والا باغ بنتا نظر آتا تھا۔ نہرو کی ڈسکوری آف انڈیا سے جو اقتباس اوپر پیش کیا گیا، اس سے ہندوستان کی انقلابی اور انتشاری صورتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو کم و بیش حکومت برطانیہ کے زیر سایہ پرورش پانے والی تمام قوموں اور ملکوں میں ایسی انقلابی صورتیں موجود تھیں، جن پر بعد کو دوسری عالمگیر جنگ مستزاد ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ جوشؔ کی انقلابی یا جنگ جویانہ (MILITANT) فکر کو جو غذا مل رہی تھی، وہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی انتشاری صورتیں ہی تھیں جو روز بروز ملک کو انقلاب کی طرف لئے جارہی تھیں ۔ جوشؔ انھیں سب حالات کو ہر طبقے میں دیکھ رہے تھے۔ یہی سب حالات ان کی شعری فکر کا مسالہ بنتے تھے۔ یہاں تک کہ مرثیہ جیسے مقدس موضوع میں بھی انھوں نے یہ انقلابی اور ملیٹنٹ اقدامی جہت تلاش کرلی تھی۔ اپنے مرثیے ''حسین اور انقلاب'' میں کہتے ہیں۔

تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو
آواز دے رہا ہے زمانہ بڑھو بڑھو
ایسے میں باڑھ پر ہے جوانی بڑھے چلو
گر جو مثال رعد گرج کر برس پڑو
ہاں زخم خوردہ شیر کی ڈھکار دوستو
جھنکار، ذوالفقار کی جھنکار دوستو

تلوار شمر عصر کے سینے میں بھونک دو
ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو

اپنی نظم ''ذاکر سے خطاب'' میں کہتے ہیں:

ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینۂ افکار پر
اور حسین ابن علی کا ہاتھ تھا تلوار پر

یہاں اس اندرونی اور فکری کیفیت پر نظر رکھنا چاہئے جو، ان مصرعوں میں اندرونی طور پر دوڑ رہی ہے جہاں اصل چیز شاعر کی اکسانے والی اسپرٹ ہی ہے۔ الفاظ اور تناسبات تو محض ایک طرح کا کور (Cover) ہیں۔ اسے بھی جوش کے انقلاب اور ملیٹنسی (MILITANCY) کی ایک لہر سمجھنا چاہیے جس میں عصریت، تاریخیت اور ایقان میں ڈوب کر جنگ اور انقلاب کے لئے تیار کرنے والی کوشش پھیلتی نظر آتی ہے۔ یہاں شمر اور یزید کی علامتوں میں انگریز اور مغربی طاقتوں کے ظلم و تعدّی پر عمل کرنے والی طاقتیں ہی پائے کوب ہیں جن سے مقابلے کے لئے، ''حسین ابن علی کا ہاتھ تھا تلوار پر'' والی صورت، ہندوستانیوں کو اختیار کرنی پڑے گی۔ اسی خاطر، وطن کے لئے جان دینے کو جوش نے مقصد نہیں بلکہ ذریعہ بنایا ہے اور ذریعے کو، بغاوت، جنگ جوئی، قومی تحرک اور بیداری کے راستوں ہی سے چلنا ہوگا۔

یہاں بے محل نہ ہوگا، اگر ایک بات کا اور ذکر کر دیا جائے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے ۲۰۰۲ء میں سردار جعفری پر ''علی سردار جعفری۔ شخص شاعر اور ادیب'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں سردار جعفری نے عجیب بات لکھی ہے کہ شاعری میں لفظوں کی طاقت اور زور پر باتیں کرتے ہوئے مشہور جرمن مستشرق، انا ماری شمل (ANAMARI SCHEMEL) نے لکھا ہے۔ ''جس پر ہماری نظر کبھی نہیں گئی کہ انیسویں صدی میں جو اردو کے طویل مرثیے لکھے گئے، ان میں پیروٹیسٹ (Protest) موجود ہے انگریزی راج کے خلاف اور اس کو اسی طرح (ان کوٹ) UNQUOTE کرنا پڑے گا جس طرح QUOTE کو UNQUOTE کیا جاتا اور پڑھا جاتا ہے۔'' (علی سردار جعفری۔ شخص، شاعر اور ادیب: مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۱۵ مطبوعہ ۲۰۰۲ء) شاید یہ بہت دور کی کوڑی لانا ہوا کیونکہ مرثیوں کا مقصد، ہمیشہ سے ''مقصدِ ذبح عظیم'' کی

اشاعت اور کسی حد تک ثواب اخروی کا حصول ہی رہا ہے۔ ہاں مرثیوں میں جنگی اظہاریت میں تیور اور محسوسات کا تیکھا پن، کسی حد تک حالات زمانہ کا انعکاس بن سکتا ہے۔ بہر حال جوشؔ کے مرثیوں میں یہ جہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کے ایک اور مرثیہ، موجد و مفکر کا بند ہے:

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم کے سر پر قدم
خاک میں پھر مل چکا ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پر مارتے پھرتے ہیں ٹھونگیں پھر درم
کھل چکا ہے پھر دل انساں میں سونے کا علم
پھر دف زر بج رہا ہے، شور ہے اشرار کا
صف شکن! یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

ایک دوسرے موقع پر عامتہ الناس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

عصر حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار
تم مصلوں پہ دوزانوں ہو، مسلّح اشرار
شور ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں
لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

یہاں بھی ''لب پہ نالے'' اور ''ہاتھ میں تلوار'' کے الفاظ اشاری ہیں جنھیں جنگ جوئیت کی ترغیب سمجھنا چاہئے۔ خالی خولی بیان واقعہ نہیں۔ یہی ترغیب، اوپر کے بند کے مصرعوں میں بھی ہے: ''صف شکن، یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا۔'' جو اپنے ملکی حالات کے لئے ہے۔ اس طرح انا ماری شمل کی یہ بات کہ مرثیے غیر ملکی حکومت کے خلاف ایمائی اور علامتی طور پر ایک طرح کا احتجاج بھی تھے، جزوی طور پر درست ہو بھی سکتی ہے۔ اگر چہ یہ مرثیہ پاکستان میں لکھا گیا ہے جہاں ملکی حکومت تھی۔ شاید وہاں کی فوجی حکومت کے خلاف، سیاسی صورت حال میں یہ باتیں کہی گئی ہوں۔ جہاں ایسا ظلم و جبر ایک وقت میں بہت عام ہو گیا تھا۔ تاہم جوشؔ کے ایسے مرثیوں میں، ایسے حصوں کو صرف عوام مخالف، دست تعدّی کے خلافت آواز ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

کربلاؔ، اب بھی حکومت کو نگل سکتی ہے

کربلا، ظلم کو تلووں سے مسل سکتی ہے
کربلا، وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے
کربلا قلعۂ فولاد ہے جراروں کا
کربلا نام ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

یہاں کربلا ایک عوامی طاقت کی علامت بن کر ابھرتی ہے، جو ظالموں کا قلع قمع کر دے گی۔ یہ ایک انتباہ اور چیتاونی بھی ہے جس میں ملیٹنسی کی لہروں (VIBRATIONS) کے ساتھ جوش کا آہنگِ انقلاب بول رہا ہے۔ ان بیانات کو کوئی کربلائیت کی تبلیغ نہ سمجھے بلکہ جوش کا حالات کو بدلنے کا نسخہ سمجھے جس کا راستہ، انقلاب اور جنگ جوئیت کے گلیاروں سے گزرے گا۔ اسی لئے یہاں الفاظ بھی تہدیدی ہیں، مدافعتی (DEFENSIVE) نہیں۔

جوش نے اپنے ان انقلابی خیالات کی توسیع اور ان کی کیفیات کی اظہاریت کے لئے جو زبان اور الفاظ کے مجموعے (CLUSTER OF WORDS) اور ترکیبیں اپنی ایسی شاعری میں استعمال کئے ہیں، ان کا تجزیہ نیز ان کے تحرکات کے اندرونی اور بیرون کے کھیل کا جو اس انقلابی اور ملیٹنسی والی شاعری میں استعمال ہوا ہے، سب کا اندازہ کرنا بہت ضروری ہے کہ یہ صورتیں ان الفاظ اور تراکیب میں پرت در پرت اپنے معنوی تحرکات اور مہیّج نیز معانی کی پرکشائی سب کی شرح وسط رکھتی ہیں۔ ان پر سے اوپری طور سے سرسری گزرنے والے، ان کے بطون اور تہہ داریوں کا اندازہ نہیں کر سکیں گے۔ ان الفاظ کی ایسی کیفیات اور مختلف الالوانیوں (manysidedness) کا ادراک بھی قاری اور سامع کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کیفیات کی تہہ داریاں بھی جوش کی شاعری میں خاصہ کردار نبھاتی ہیں۔ پھر، ان کی تشبیہات، استعارے اور جذبات کی پیکر تراشیوں کا ایک نگار خانہ بھی ساتھ چلتا رہتا ہے جن میں وقت، تاریخ، تہذیب اور گردوپیش کی تجرباتی دنیا منعکس ہوتی ہے۔ یہاں سیاست کی گرماگرمی، پینترے بازیاں، ملیٹنسی کی بیرونی فضا بھی ہے جو سامعین اور متاثرین کے لئے ایک مہیّج کا کام بھی کرتی جاتی ہے اور حالات کی اظہاریت میں بھی معین ہوتی ہے۔ جوش کی ایسی شاعری میں، ان پیچداریوں اور صورتوں سے کنارہ کر کے کوئی بھی، ان کی انقلابی اور ملیٹنسی والی شاعری کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکے گا۔ ☆☆

جوش کی شاعری میں احتجاجی لہجہ کی معنویت

ڈاکٹر قمر رئیس

جوش کی شاعری فکری جولانی اور تخلیقی رنگ سامانی کا ایسا قلزم ہے جس میں ہواؤں کے تند جھونکوں سے کبھی طوفانی لہریں اُٹھتی ہیں کبھی بادِ نسیم کے نرم ہاتھوں سے سبک رو موجیں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پُر شور طغیانی کے تھپیڑوں سے اس کے ساحلوں پر جھاگ اُٹھتا ہے اور اس جھاگ کے اندر بس جھاگ ہی ہوتا ہے لیکن جوش کی تخلیقی جولانی کی اصل صورت تو لہروں کے نیچے کے تموج میں ہی دیکھی جاتی ہے۔ اندر ہی اندر جہاں کئی دھارے بہتے ہیں۔ کبھی متوازی اور کبھی ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے۔ یہ دھارے کبھی گہرائی سے نمودار ہو کر اوپر کی طرف سمٹ آتے ہیں کبھی اوپر سے اُٹھ کر نیچے کی گہرائیاں ناپتے ہیں۔ اس آویزش اور برقی روانی میں ایک انمول توانائی جنم لیتی نظر آتی ہے اور کبھی کبھی لہروں کی کشمکش اور ٹکراؤ سے بہالے جانے والی انرجی بھی متحرک دکھائی دیتی ہے۔

جوش کے ذخیرۂ شعری کی اس تمثیل پر راقم الحروف کو اعتماد اس لیے ہے کہ آج کل یہ حقیر قومی کونسل کی ہدایت پر جوش کے کلیات کی تدوین کا مشکل کام انجام دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کے اکثر مجموعوں کی سیر کرتے ہوئے اس تمثیل نے آنکھیں کھولیں۔ اس مطالعہ کے نتیجہ میں جوش کی

شاعری اور اس کے تخلیقی اور فکری مآخذ کے جن حوالوں تک رسائی ہوئی وہ حیران کر دینے والے تھے۔ یہ حیرانی اور اس سے جڑی سوچ کی پریشانی اب بھی باقی ہے۔ اس لیے جوش کے کثیر جہتی شعری رویوں کے ایوان میں داخل ہونے اور کسی تہ دار موضوع کا انتخاب کرنے کے بجائے گفتگو کے لیے نسبتاً ایک اکہرے سے موضوع کو چنا ہے اگر چہ اس کی اپنی مشکلات بھی کم نہیں ہیں۔

شاید بات یہاں سے شروع کرنا ضروری نہیں کہ عہد قدیم کی عالمی شاعری کے ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ احتجاجی جذبات اور فکر سے جڑا ہے۔ قدیم یونان اور خطہ عرب کے علاوہ کنفیوشس کے افکار سے اثر پذیر عہد عتیق کی چینی شاعری میں بھی احتجاجی لہجہ کی کھنک صاف سنائی دیتی ہے۔ ہندوستان میں بھی بدھ مت کی جاتک کہانیوں اور وبھوتی کے ناٹکوں سے کبیر اور رائداس کی شاعری تک سماجی احتجاج کے کتنے حیاتی رویے گندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شاید اس جائزے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ عہد وسطیٰ کی سامنت شاہی سے اعلیٰ معیار کی نازک اور لطیف شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں جبر و استبداد اور ہر طرح کے انسانی استحصال کے خلاف کسی احتجاج کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس دور میں عاشقانہ جذبات، نشاط انگیز معاملات اور افسانوی طلسمات نے ہر طرح کے شعری اظہار میں اپنی مستقل جگہ بنالی تھی۔ یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ اس عہد میں خواہ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی ریاستیں ہوں یا دوسری مطلق العنان مملکتیں زباں بندی کا قانون اتنا متشدد تھا کہ بڑے بڑے سخنور بھی صرف ان ہی جذبات، واردات اور خیالی حکایات کے اظہار و بیان پر گزر بسر کر رہے تھے جو اہل اقتدار کی پُرتعیش زندگی کے تانے بانے سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ ان میں تخلیقی جوہر سے بہرہ ور جو با کمال تھے وہ اس تنگ گھٹی گھٹی وادی میں بھی جذبات کی بوقلمونی اور تخیل کی رنگینی میں اپنے ہنر کی تکمیل اور تابناکی کے پہلو تلاش کر لیتے تھے۔

جوش کی شاعری کا آغاز وارتقا ان کی خوش قسمتی سے، ایک ایسے دور میں ہوا جب کم از کم تہذیبی ورثہ اور معاشرتی حقائق کے بارے میں سچ بولنے یا اُن کے حوالے سے شخصی تجربات کو بے کم وکاست بیان کرنے پر کوئی خاص پابندی عائد نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ روایت گزیدہ سماج میں بے باکی سے سچ بولنے کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ اکبر الہ آبادی نے البتہ حق گوئی کی ہمت کی تو

ظریفانہ پینتروں کے رنگین غلافوں نے ان کے احساس کی تلخی اور تندی کو خاصہ تحلیل کر دیا۔ یہاں ایک بزرگ کا قول نقل کرنا شاید بے جانہ ہو۔

"If reality is not presented in stark maked form, it simply turns into hypocrisy"

''اگر حقائق کو صاف برہنہ صورت میں بیان نہ کیا جائے تو یہ رویہ منافقت بن جاتا ہے۔''

تلخ سچائیوں سے چھلکتی ہوئی حقیقتوں کی پردہ پوشی کرنا اوران کی جگہ سامنے کی بے ضرر سی حقیقتوں کو بیان کرنا، خواہ اس کے پیچھے کیسی ہی مصلحت ہو ایک طرح کی منافقت ہی ہے۔ جوش جاگیرداری نظام کی بعض کمزوریوں کا شکار ہو کر بھی، اس کی مصلحت آمیز منافقتوں سے ہمیشہ بیزار اور برسر پیکار رہے۔ اس طبعی میلان نے ان کے کردار کی بنیادی پہچان اور افتاد کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور اس سے جدا ہونے کے لیے وہ کسی حالت میں تیار نہیں تھے۔

جوش صاحب نظر ہوں یا نہ ہوں لیکن دین بزرگان کو خوش کرنے کی رغبت کبھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوئی۔ جوش نے ''روح ادب'' کے دیباچہ میں اپنے لڑکپن کی سرکشی اور غضبنا کی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میری سیاسی نظموں میں جو خطیبانہ لہجہ جھلکتا ہے وہ اسی افتاد کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں جوش رواجی مذہب پر اعتقاد رکھتے تھے۔ معرفت الٰہی کے لیے رکوع وسجود میں غرق رہتے تھے۔ افلاطونی عشق کے قائل تھے۔ لیکن باغیانہ اضطراب کی جو کمانی آہستہ آہستہ اُن کے اندر کھل رہی تھی ایک دن اس نے انھیں ان آبائی عقائد و رسوم سے بیگانہ کر دیا۔ والد کے سمجھانے پر بھی وہ جدی عقائد کی طرف واپس نہیں لوٹے۔ یہاں تک کہ ان کی اس گمراہی پر اُن کے والد نے وصیت لکھ کر انھیں اپنی جائداد سے محروم کر دیا۔ لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ جوش فکر واظہار کی آزادی کو اپنی تخلیقی شخصیت کا محور جانتے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک سوچنے والا ذہن رکھتے تھے لیکن یہ ذہن کسی ضبط ونظم کا پابند نہیں تھا۔ اس پر مغربی شعرا کی رومانوی حسیت اور ٹیگور کی ماورائیت کا کچھ اثر ضرور تھا۔ ویسے بھی کسی تخلیقی فن کار کے لیے کسی منظم نظام فکر کو اُٹھا کر چلنا ضروری نہیں۔ اس بوجھ سے اکثر یا تو وہ خود تھک جاتا ہے یا اس کی شاعری یا اس

کے قاری۔ افکار کے ساتھ علامتوں کی تکرار کا بوجھ الگ سے ہوتا ہے۔ جوش نے شعوری یا ارادی طور پر کبھی اس بار برداری کی کوشش نہیں کی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جوش کی شعری بوطیقا میں فکر کا کوئی مقام نہیں یا شاعری میں وہ حکمت و دانش کی معنویت کے منکر تھے۔ اس کے برعکس فکر اور اس کی تازہ کاری ہی تو ان کی سخنوری کا کلیدی وظیفہ ہے۔ لیکن جوش کے یہاں یہ ایسی فکر ہے جس میں بشری اور سماجی سروکار روح بن کر دوڑتے ہیں۔ اس کو مہمیز کرتے ہیں۔ اسے بنی نوع انسان کی آزادی فلاح اور ترقی کے آدرشوں سے جوڑتے ہیں۔

جوش کی شاعری کے ارتقائی سفر کی یہی وہ منزل ہے جہاں وہ آزادانہ طور پر اپنی جدی وراثت، اپنے رواجی عقائد اور اپنے تہذیبی اور سماجی اداروں کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس طرح کی گرفت اصلاح معاشرہ کے نام پر پہلے بھی ہوتی رہی تھی۔ جوش اس کی تنگ دامانی سے آشنا تھے۔ ان کی موضوعی سرکشی کو ایسے معروضی وژن اور کارگر آلات کی تلاش تھی جو معاشرہ کی کمزوریوں، انسان دشمن طاقتوں، استحصالی حربوں، تقلیدی رسوم اور ہر طرف بکھری ہوئی غلاظت کے ڈھیروں کو الم نشرح کر سکیں۔ جوش کہتے ہیں۔

ہاں نوعِ بشر چیں بہ جبیں ہے اب تک
انسان ''راہ راست'' پر نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مُودہ کہ ''سرکش'' بندہ
تھا روزِ ازل جہاں وہیں ہے اب تک

گویا خدا نے انسان کو سرکشی کی پاداش میں دنیا میں بھیج کر جو سزا دی تھی وہ ابھی تک اسی سخت عقوبت یا عذاب سے گزر رہا ہے۔ اس رباعی میں طنزیہ لہجہ نے کئی معنوی دائرے بنا دئے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ انداز جوش کے شعری لہجہ کا ایک منفرد زاویہ بن گیا۔

یہی وہ منزل تھی جہاں جوش کو انسانی ذہن، اوہام اور افکار و عقائد کی بہت سی زنگ خوردہ زنجیروں میں جکڑا نظر آیا۔ ان کی تعقل پرستی (Rationalism) اور دوسرے جدید مادی نظریات کی تیز روشنی میں زندگی کی حقیقی سچائیاں اب ان کے روبرو آجاتی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ عقلی شعور سے عاری بچپن کی تعلیم Conditoning انسان کو گرد و پیش کی سلگتی ہوئی حقیقتوں سے کس درجہ بیگانہ

کر کے ظلمت پرستی کے پنجروں میں قید کر دیتی ہے۔ اس احساس کی تلخی نے جوش کے کلام میں احتجاج کی ایسی صورت اختیار کر لی جو سیکڑوں اشعار میں بڑے موثر انداز سے جلوہ دکھانے لگی۔ مثلاً:

منطق کو برہنہ پا کیا ہے ہم نے
اوہام کو تاج زر دیا ہے ہم نے
اب تک نہیں اُترا ہے وہ زہر اقوال
بچپن میں جو کانوں سے پیا ہے ہم سے

جوش کے فکر و نظر کی ترجمانی کرنے والی ہر تحریر اور ہر تخلیق میں ان کی تعقل پسندی اور سائنسی بصیرت شفاف صورت میں نظر آتی ہے۔ روشن خیالی کے اس ذہنی رویے کو انھوں نے اپنی شاہکار نظموں مثلاً ''موجد و مفکر'' حرف آخر اور لافانی حروف میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں ایک جانب انھوں نے بنی نوع انسان اور اس کے تہذیبی اور مادی ارتقا کی کہانی سائنسی زاویہ سے بیان کی ہے دوسری جانب انھوں نے نظریۂ علم کو بھی ایک نئی سطح پر پیش کیا ہے۔ جوش کا نظریہ علم حرکی، عملی اور ہمہ گیر ہے۔ انسانی تمدن کے ارتقا میں وہ اُسی سائنسی علم کو کارفرما دیکھتے ہیں جو انسانی محنت اس کی تخلیقیت اور تجربات کی دین ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی اور قدیم جامد علوم کو انسانیت کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ حکمت و دانش کی نئی لہروں سے چھلکتی جوش کی نظمیں، خشک اور بے کیف منظوم افکار کا نمونہ ہوں۔ اس کے برعکس یہ شاعرانہ حسن کا بڑا نادر نمونہ ہیں۔ 'موجد و مفکر' میں کائنات کے مادی ارتقا کے بعد جب وہ زمین کی تخلیق کو بیان کرتے ہیں تو اس کا تخلیقی حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مژدہ ہستی لیے موج صبا آنے لگی
قلزموں نے ارغنوں چھیڑا زمیں گانے لگی

اور پھر اک دلفریب و دلنشیں انداز سے
خاک سے پودوں نے اپنے سر نکالے ناز سے

اور پھر کچھ تھم کے اُٹھی ایک موج سرخوشی
قلزموں میں زندگی کی اولیں جنبش ہوئی

خاک نے انگڑائی لے کر اپنے جوڑے کو چھوا
آئی سطحِ بحر سے میلاد خوانی کی صدا

دہر کے تاریک گوشے تک منوّر ہوگئے
زندگی کی سانس سے جھونکے منور ہوگئے

جوش کی شاعری میں احساس کی تلخی، اور احتجاجی لہجہ کی دھار دو اطراف میں خاص طور پر تند و تیز ہو جاتی ہے۔ ایک ہے ضعیف الاعتقادی اور مذہب کے اجارہ داروں کی منافقت اور دوسری ہے عوام کا استحصال کرنے والی طاقتوں کے ساتھ مل کر اہل سیاست کے ڈھونگ اور فریب کاریاں۔ اولاذکر دائرہ میں فتنۂ خانقاہ 'مولوی' اور ذاکر سے خطاب، جیسی مشہور نظمیں شامل ہیں۔ ان میں طنز وتعریض کا نشانہ مذہب کو پیشہ وتجارت بنانے والے ہوس پرست ہیں۔ مذہب کی اصل 'خدا' رسول، اہل بیت یا مقدس مذہبی شخصیتوں کے خلاف ان میں کسی جارحانہ جذبہ کا اظہار نہیں ہے۔ غلامی کے دور میں اشتعال انگیزی کی بنیاد پر جب فساد اور فرقہ پرستی کا فتنہ سر اُٹھاتا تھا تو جوش تڑپ اُٹھتے تھے۔ آزادی اور متحدہ قومیت کا خواب انھیں ٹوٹتا اور خون میں نہاتا نظر آتا تھا۔ ان کے احساس کرب و محرومی میں تلخیاں گھل جاتی تھیں۔ 'مقتل کانپور'، 'نعرہ شباب' اور دوسری کئی نظموں کے شعری اظہار میں شاعر کی اذیت اور بیزاری احتجاجی لہجہ کی شعلگی میں ڈھل جاتی ہے۔ زیادہ مثالیں دینے سے احتراز کر رہا ہوں۔ 'مقتل کانپور' کے یہ دو اشعار دیکھیے۔

سُبحہ و زُنّار میں جکڑے ہوئے دیوِ سیاہ
تو ابھرتے ہی زمانہ کی نظر سے گر گیا

اُٹھنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی شادماں باش و غلامی زندہ باد

ہندو مسلم فساد اور فرقہ پرستی کی آگ نے شاعر کو مایوس کر دیا ہے اور اس مایوسی نے تلخی اور طنز کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن زندگی کے اذیت ناک تضادات اور بوالعجبیوں نے تو ہر خطہ اور ہر دور کے باکمال ادیبوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ جوناتھن سوئفٹ ہو یا اکبرالہ آبادی۔ تیکھا سماجی شعور رکھنے والے تخلیق کاروں کے لیے طنز و مزاح ایک کارگر حربہ رہا ہے۔ اس احتجاجی رویے میں ان کا تشخص ہی نہیں ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا راز بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے جوش کو یا ان کی شاعری کو احتجاجی اسلوب اظہار کی وجہ سے معتوب نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ باکمال اور پُرگو شاعر کی طرح جوش کے ان گنت مجموعوں اور منظومات میں کئی لہجے نظر آتے ہیں جو مل کر ان کی شعری جمالیات کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان میں خود کلامی اور خود احتسابی کے لہجے بھی ہیں۔ تلقین اور تاکید کے لہجے بھی۔ انیس کے مراثی کی طرح رثائی اور محاکاتی لہجہ بھی اور کہیں کہیں خصوصاً فطرت سے تعلق میں غزل کا نرم غنائی لہجہ بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس لیے بعض دوسرے شعرا کی طرح جوش کی شعری جمالیات کو کسی ایک یا دو لہجوں میں قید کر کے دیکھنا مناسب نہیں۔— تخلیقی عمل میں ہر تخلیق موضوع اور تجربہ کی تہ داری کی مناسبت سے نمو پاتی ہے۔ اس کی تکمیل میں شاعر کی اپنی شخصیت کا افسوں بھی اضطراری طور پر شامل ہوتا ہے۔ جوش کی شخصیت میں ابتدا سے کچھ نسلی یا جینیاتی اوصاف وعناصر اور کچھ احساسِ انا کے زیر اثر، غصہ اور غیظ کے عناصر حاوی رہے۔ جس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے۔ اس لیے کوئی بھی واقعہ جو ان کی انسان دوستی کے آدرشوں اور اقدار کو مجروح کرتا ہے، اپنے ابتدائی ردِّ عمل میں انھیں مشتعل کر دیتا ہے۔ یہ اشتعال تہذیبی شعور اور تعقل پرستی کی آنچ سے تحلیل ہو کر بھی تخلیقی عمل میں کم یا زیادہ اپنا رسوخ بنائے رکھتا ہے۔ یہاں وزیر آغا کی تصنیف ''تخلیقی عمل'' کی تھیوری کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ اُن کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تخلیقی عمل کی بُنت میں دو طرح کے عناصر روبہ کار ہوتے ہیں۔ ایک منفعل (Passive) اور دوسرا فعال (Active)۔ ان میں نسلی، تجربات بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فعال عناصر طفلی سے عہد جوانی تک گھر سماج ماحول سے حاصل ہونے والے تاثرات کی پُراسراری کھتونی ہوتے ہیں۔ پھر کسی اچانک واقعہ کی تحریک پر یہ مثبت اور منفی لہریں آپس میں متصادم ہو کر ایک طرح کے نراج (Chaos) کی منزل تک پہنچ جاتی ہیں۔ فن کار اپنی شخصیت کی افتاد کے

مطابق ہی نراج کی اس صورت حال سے عہدہ برآ ہوتا اور دم گھونٹنے والی نراجی کیفیت سے نجات پانے کا جتن کرتا ہے۔ اس میں اس کی طباعی، تخلیقی وژن، تخیئلی اختراعیت اور لسانی مہارت سب بروئے کار رہتے ہیں۔ اس عمل میں وہ ایک نئی چیز یعنی ایک اچھوتی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ تخلیقی عمل کی اس تھیوری یا نظریہ کو اگر صحیح مانا جائے تو اس عمل کی کارفرمائی جوش کی نظموں میں صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ تاہم ان کی اکثر و بیشتر نظموں میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انفعالی عناصر کے بجائے فعالیت کی لہریں ہی زیادہ دخیل رہتی ہیں۔ اس طرح کہ کہیں وہ تہ نشیں ہوتی ہیں جو فطرت اور عورت کے لازوال حسن کی پرستش پر انھیں آمادہ کرتی ہیں۔ کہیں اتنی حرکی کہ تخلیقی تجربہ کو شاعر کے وجود کی نادیدہ گہرائیوں میں لے جاتی ہیں جو اُن سے زوال جہانبانی، کسان موجد و مفکر اور شکست زنداں کا خواب جیسی شاہکار نظمیں لکھواتی ہیں۔ اور کہیں فعالیت کی یہ لہریں سیکڑوں رباعیات کے فانوسوں سے فکر و نظر کے ایسے در و بام سجاتی ہیں کہ اقوامِ شرق کے شعری سرمایہ میں جن کی مثال نہیں ملتی۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ تخلیقی عمل کے منفعل یا سلبی لہروں سے جوش کا سروکار بہت کم رہا ہے۔ اُن کا واسطہ ہمیشہ اس کی فعال اور مثبت لہروں سے رہا۔ اس لیے کہ یہی ان کے کردار کی افتاد کا فطری تقاضہ تھا۔ اُن کے تخلیقی جوہر کی ساری جولانیاں انھیں اسی رُخ پر لے جاتی ہیں۔ شعری لفظیات پر ان کی لاثانی قدرت کے فرس اسی میدان میں بجلی کی طرح لپکتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ جوش کے احتجاجی لہجہ کی طرفگی توانائی اور تازگی، تخلیقی ہنر کی نزاکتوں کو آزماتی تھیں۔ اس کے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ جوش کی ان گنت رباعیوں میں بھی احتجاجی فکر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ صرف دو رباعیاں دیکھیے۔

قانون سے جب خموش ہوتی ہے زباں
تو ہونکنے لگتے ہیں دلوں میں طوفاں

جب پشتِ گدا، کرب سے جھک جاتی ہے
سلطان کے تاج پہ کڑکتی ہے کماں

ہنستے ہیں جو بوسیدہ، سیہ خانوں پر
گرتی ہے سدا برق اُن ایوانوں پر

جو بولنے دیتے نہیں پا مالوں کو
گھن بولنے لگتا ہے ان انسانوں پر

احتجاجی فکر اور انقلابی شعور کی رسوائی دراصل ان شعرا کے ہاتھوں ہوئی جنھوں نے اسے سیاسی نعروں اور نظریاتی مناجاتوں میں ڈھالنے کی سعی کی۔ برطانوی غلامی کی لعنت کے خلاف چند سیاسی نظموں سے قطع نظر، جوش کی شاعری میں، جہاں جہاں ذہنی، تہذیبی یا معاشرتی احتجاج کی لہریں پیدا ہوئی ہیں وہ ان کے فن کی شریعت اور شعری جمالیات کا ایک فعال حصہ بن کر ہی سامنے آئی ہیں۔ اور اس نے ان کے معاصرین کی نظم نگاری کو متاثر کیا ہے۔ اس سچائی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

مراثیِ جوشؔ اور تحفظِ حقوقِ انسانی

فضلِ امام رضوی

جوشؔ ملیح آبادی نے ڈاکٹر ہلال نقوی کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک بہت اہم بات کہی تھی جو ان کی مرثیہ نگاری کی محرک تھی۔ جوشؔ کا بیان ملاحظہ ہو:۔

> ''ایک دن ایک بہت بڑے انگریز افسر مسٹر Burn نے جو بہت بڑے عہدے پر فائز تھا اور عربی اور فارسی بھی جانتا تھا مجھ سے کہا کہ جوشؔ صاحب آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے۔ میں نے کہا، جی ہاں........ کہنے لگا........ آپ محرم سے واقف ہیں؟ میں نے اس سے کہا کہ صاحب آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟ کہنے لگا، ہاں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے حسینؑ کی شہادت سے کیا فائدہ اٹھایا، آپ صرف آنسو بہاتے ہیں۔ جوشؔ صاحب اگر صرف مٹھی بھر مسلمان حسینؑ کی اسپرٹ (Sprit) کو سمجھ لیں تو برٹش امپائیر (Brtish Empire) تین مہینے میں ختم ہو جائے'' یہی وجہ تھی کہ میں ایک نئے جذبے کے سات ''مرثیہ'' کے میدان میں آیا''

جدید مرثیے کے تین معمار...... ہلال نقوی ص ۱۲

جوشؔ مرثیہ گوئی کا مقصد صرف رونا رلانا نہیں قرار دیتے بلکہ ذہنوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مرثیہ نگار کا فرض ہے کہ باطل سے ٹکرانے کی حرارت و جرأت، جابر سلطانوں کے سامنے حرف حق کہنے کا حوصلہ اور تاسیّ حضرت امام حسینؑ کا جذبہ پیدا کرنے کا شعور

بیدار کرے۔

حالانکہ جوشؔ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک زمانہ میں گریہ و بکا پر ختم ہونے والے مرثیے محبان اہل بیت رسولؐ کے لیے ایک سیاسی حربہ تھے۔ بنی امیہ کے ہاتھ میں طاقت آگئی تھی اور عاشقان آل محمدؐ کے پاس کچھ نہیں رہا تھا چنانچہ انھوں نے آنسوؤں سے بنی امیہ کے تخت و تاج کو بہا دیا۔

جدید مرثیے کے تین معمار...... ہلال نقوی ص ۱۲

جوشؔ جدید مرثیہ نگاری کے سرخیل ہیں۔ ان کے پیش نظر جدید مرثیہ اسے کہتے ہیں اور کہیں گے جو تاسّی حسین ابن علیؑ پر ابھارے اور وہ مراثی جو اس روح کو پیش کرنے سے قاصر ہیں لاکھ عہد حاضر سے متعلق ہوں، جدید نہیں کہلائیں گے۔

جدید مرثیے کے تین معمار / ہلال نقوی ص ۳۳

جوشؔ نے کل نو مرثیہ لکھے ہیں جسے ان کے شاگرد ڈاکٹر ہلال نقوی نے شایع کر دیا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔آوازۂ حق	۱۹۱۸ء	۹۲ بند
۲۔حسینؑ اور انقلاب	۱۹۴۱ء	۹۸ بند
۳۔موجد و مفکر	۱۹۵۶ء	۱۱۶ بند
۴۔وحدت انسانی	.....	۷۶ بند
۵۔طلوع فکر	۱۹۵۷ء	۱۱۰ بند
۶۔عظمت انساں یا قلم	.....	۸۸ بند
۷۔آگ	۱۹۵۹ء	.....
۸۔زندگی اور موت	۱۹۶۵ء	۸۶ بند
۹۔پانی	۱۹۷۱ء	۵۹ بند

درج بالا مراثی کو ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے بھی پاکستان سے بڑے اہتمام کے ساتھ جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کے ساتھ مع فرہنگ ۱۹۸۰ء میں شایع کر دیا ہے۔

جوشؔ نے صرف ایک مرثیہ اور پہلا مرثیہ ''آوازۂ حق'' قدیم انداز کا لکھا ہے جس میں اجزائے ترکیبی بالترتیب برتے گئے ہیں۔ بقیہ تمام مراثی نئے شعور و افکار کا نتیجہ ہیں۔ یوں تو جوشؔ کی شاعری میں لیکن خصوصی طور پر مرثیہ نگاری میں عصری حسیّت اور عصری آگہی شعوری طور پر ملتی ہے۔ آفاقی مسائل اور بین الاقوامی موضوعات کو کربلا کے پس منظر میں فنی محسنات کے ساتھ پیش کرنے میں ید طولا رکھتے ہیں۔ دراصل جوشؔ کے مراثی اردو شاعری میں ایک بالکل نئی شاہ راہ کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے مراثی نے اپنے اپنے زمان و مکان میں شعراء کے شعور و لاشعور کو تکان دی ہے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جوشؔ کے حنک دار لہجے کی صدائے بازگشت صرف دوسرے مرثیہ نگاروں میں ہی نہیں بہت سے نظم نگاروں اور غزل گو شعراء کے یہاں بھی کبھی یہ گونج دھیمی اور کبھی بلند آہنگ طور میں ملتی ہے۔

آج جب کہ حقوقِ انسانی کے تحفظ کے لیے Human Right Commission قومی اور بین الاقوامی سطح پر قائم کیے جا رہے ہیں لیکن آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جوشؔ نے اذہانِ انسانی کو اس اہم ترین مسئلے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل دونوں دم توڑ چکی ہیں۔ لیگ آف نیشن پہلے ہی مرحوم ہو چکی تھی...... ان حالات میں جوشؔ کے مراثی آج بھی تحفظ حقوقِ انسانی کے اہم منشور اور دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند بند۔

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا، بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا
کہتا ہوں پھر کہ دل میں کدورت نہ چاہیے
وحدت کے سر پہ، ضربت کثرت نہ چاہیے

مطلق اکائی میں، عدویّت نہ چاہیے
غیریّت و شرو عصبیّت نہ چاہیے
آفاق ایک جسم ہے، اور ایک ذات ہے
اے دوست، وہم غیر جہالت کی بات ہے

درج بالا دونوں بندوں میں قرآن مجید کی آیت ''لقد خلقنا الا انسان فی احسن التقویم'' اور گیتا کی تعلیم کا خلاصہ نظر آتا ہے گیتا میں بھی تمام انسانوں کوایک خاندان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ उदार चरिता नाम वासुदेव कुटुम्बुकम یعنی تمام روئے ارض پر بسنے والے انسان ایک ہی خاندان کے ہیں۔انھیں علاحدہ علاحدہ خانوں میں تقسیم کرو۔ جوشؔ نے بھی مشرق و مغرب شمال و جنوب گورے اور کالے کے امتیازات اور تفریق کو غلط قرار دیا ہے اور وہ اس تفریق کو جہالت قرار دیتے ہیں۔

سرمایہ داری نے جس طرح انسانی سماج کا استحصال کر رکھا ہے وہ بالکل روشن ہے۔ نظام معاش کے سلسلہ میں اگر سوال صرف سرمایہ داروں کے ختم کرنے تک کا ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ یہ نفرت کے جذبات اس گروہ کو ختم کر کے انسانیت کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکتے مگر اصل سکہ سرمایہ داروں کا ہے کیونکہ یہی بے قید سرمایہ داری انسان کو ظالم سرمایہ دار میں تبدیل کر دیتی ہے اور آدمی، آدمی سے ٹکرانے لگتا ہے اور پھر بغاوت کے طرفہ انداز سامنے آتے ہیں۔ جوشؔ نے اپنے مراثی میں اس سمت اشارہ کیا ہے:۔(موجد و مفکر)

ہو چکے ہیں غرق پھر شیرازہ بندی کے عروق
پھر رواں ہیں ذلتیں سوئے تنفر جوق جوق
پھر شریعت ہے، مساوات بشر کی بے وثوق
پھر خجل ہیں نوع انسانی کے بنیادی حقوق
پھر بغاوت کر رہا ہے زندگی سے آدمی
دیکھ پھر ٹکرا رہا ہے آدمی سے آدمی
ہونکتا پھرتا ہے پھر سرمایہ داری کا وقار
اٹھ چکا ہے پھر عوامی برتری کا اعتبار

پھر خزاں کی آستاں بوسی پہ نازاں ہے بہار
پھر خدا کا ذوقِ تخلیقِ بشر ہے شرمسار
پھر زبوں ہے نفسِ انسانی کی حالت یا حسینؑ
آ، کہ پھر دنیا کو ہے تیری ضرورت یا حسینؑ

(موجد و مفکر)

جوشؔ کا سماجی اور سیاسی بیدار شعور ان کے مرثیوں میں بھرپور توانائی اور رعنائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آج کے اس دودِ جہل پرور پر بھی وہ تبصرہ کرتے ہیں اور بھرپور ضرب لگاتے ہیں۔ ہوش ربا ہنگامہ بھی ان کے پیشِ نظر ہے اور عوام کی بے کسی و بے بسی کا المیہ بھی۔ فرماتے ہیں:۔

(وحدتِ انسانی)

جہال کی زبان پہ ہوں لن ترانیاں
اشرار خود غرض کو ملیں حکمرانیاں
برسیں حقیقتوں کی زمیں پر کہانیاں
کھانے لگیں عوام کا گودا گرانیاں
سفلوں سے بھیک اہلِ سخا مانگنے لگیں
مرنے کی اہلِ علم دعا مانگنے لگیں

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم کے سر پر قدم
خاک میں پھر مل رہا ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پر مارتے پھرتے ہیں ٹھونگیں پھر دِرم
کھل چکا ہے پھر دلِ انساں میں سونے کا علم
پھر دَفِ زر بج رہا ہے، شور ہے اشرار کا
صف شکن یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

(وحدتِ انسانی)

روئے ارض پر جب فتنہ و فساد پھیلایا جانے لگے۔ صحنِ انسانیت غبار آلود ہو جائے۔

معاشرا شرار کی آماجگاہ بن جائے.........اور جب حقوق انسانی ڈھائے جانے لگیں اصول و آئین آدمیت توڑے جائیں اور ظلوم بوئے جانے لگیں اور جہول اگائے جانے لگیں.......اور پھر یہ منظر اس طرح کا ہو جائے یعنی

محلوں میں جلوہ ریز ہوں ارزال خیرہ سر
چالاک رہزنوں کو ملے منصبِ خضر
سفلوں کی ہو نشست سر تخت سیم وزر
اقطاب روزگار کے بستر ہوں خاک پر
آئے اجل عوام کی جانوں کے واسطے
دنیا ہو صرف چند گھرانوں کے واسطے

جب یہ حالات ہو جائیں تو پھر..........جوشؔ فرماتے ہیں:۔

اس وقت فرض ہے کہ برائے مفاد عام
اک مرد حق پناہ اٹھے بہر انتظام
پہلے کرے زباں سے ہدایت کا اہتمام
مانے نہ پھر بھی کوئی تو لے کر خدا کا نام
پائے ہوس سے طاقت رفتار کھینچ لے
میدان میں نیام سے تلوار کھینچ لے

جوشؔ کے مراثی اردو مرثیے کی تاریخ کو ایک بالکل نئی شاہ راہ سے متعارف کراتے ہیں۔ فکری عنصر کی شمولیت نے وسعتیں بخشی ہیں۔ جوشؔ نے پہلا مرثیہ ''آوازِ حق'' ۱۹۱۸ء میں کہا تھا۔ اس وقت ہمارے ملک میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ جنگ آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف جوشؔ نے اپنی شاعری سے کام لیا۔ واقعۂ کربلا کے علائم اور رموز سے انھوں نے بھر پور استفادہ کیا.........آزادی کی جدوجہد سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس کارزارِ حیات کو ''تازہ کربلا'' سے موسوم کیا ہے اور ''عزمِ حسینؑ'' کے طلب گار بنے رہے۔ اسی لیے ان کے مراثی جذبات کی گہرائی کے ساتھ ساتھ عملی اور نظری وسعتوں کے بھی حامل

نظر آتے ہیں وہ اپنے مراثی سے معاشرہ کی اصلاح کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مراثیء جوشؔ ہر دور کے تقاضوں کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین میں جوش، ولولہ شجاعت، ہمت، استقلال وایثار کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

جوشؔ قوم پرستی کا جذبہ (NATIONALISM) بھی انسانی حقوق کے لیے مضر قرار دیتے ہیں۔ یہ جذبہ دراصل عالم گیر تباہی کا پیش خیمہ بن گیا ہے۔ دراصل یہ جذبہ جس قوم (NATION) کے ذہن کو متاثر کر دیتا ہے وہ جذنہ اپنے قوم کے لیے خواہ سودمند ہو یا نہ ہو، لیکن دوسری قوموں کے لیے تو یقیناً تباہ کن بن جاتا ہے۔ عصبیت جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ہلاکت بار ہو جاتی ہے۔ یہ قوم پرستی کی وجہ سے افراد میں پیدا ہو جاتی ہے۔ قومیت (NATIONALISM) اپنی جگہ پر بالکل فطری چیز ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب کوئی شخص یا کوئی قوم (NATION) یہ اعلان کرنے لگے کہ میری قوم کے مفادات کے سامنے دنیا کی تمام قوموں کے مفادات یا میری قوم کے جذبات کے علاوہ دوسری قوموں کے جذبات کی کوئی حیثیت نہیں ہے تو یہیں سے انتشار اور خلفشار پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ جذبہء قوم پرستی ایسی بری بلا ہے کہ جب یہ کسی قوم کے افراد کے سر پر سوار ہو جاتا ہے تو وہ قوم اپنی برتری کے لیے ہر جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ امریکہ اس برے عمل کو انجام دینے میں سب سے زیادہ پیش پیش ہے اور اب تو اس کا صدر مہنگائی اور بھکمری کے لیے ہندوستان کو ذمہ دار ٹھہرانے میں چوک نہیں رہا ہے۔ جوشؔ نے اس پہلو پر گہرے تفکر سے کام لیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

قوموں کے درمیاں جو ہیں یہ بحر و کوہسار
یہ عہد ہائے تفرقہ انگیز ورشتہ خوار
یہ اختلاف لہجہ و نیرنگیء شعار
یہ رنگ و نسل، قوم و عقائد کی گیرودار
ان سب کا سیل جوئے اخوت کو پاٹ کر
اترا رہا ہے خون کے رشتے کو کاٹ کر

جوشؔ نے انسانی رشتوں کو اہمیت دی ہے جس میں جغرافیائی حدود کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مادّی ترقی، دنیوی ہوس اقتدار کی جوشؔ کے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ سطوت شاہی کے جبر و تشدد کو وہ بے وقعت قرار دیتے ہیں۔ خون ناحق کی بوندوں نے جبر و بربریت اور کفر و نفاق کی طاقتوں کو بہا دیا ہے۔ مظلوموں کی آہوں نے قصر حکومت کو ڈھا دیا ہے۔

یوں بہا کر رکھ دیئے، آہوں نے دولت کے دیئے
آنسوؤں میں بہہ گئے طبل و علم کے دبدبے
بیڑیوں کی گونج سے ایوان تھرانے لگے
ایک بی بی کی خطابت نے وہ ڈالے زلزلے
اشک خوں روشن ہوئے نظروں سے تارے گر گئے
خاک پر قصر حکومت کے منارے گر گئے

مختلف انداز سے جوشؔ نے عصر حاضر کے ظالموں سے برزآزما ہونے کے لیے للکارا ہے۔ یہ للکار اسوۂ حسینیؑ کی روشنی میں صلابت فکر کو مہمیز کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

زندگی شعلۂ جوالہ ہے گلزار نہیں
موت کا گھاٹ ہے یہ مصر کا بازار نہیں
اپنے آقا کی تاسّی پہ جو تیار نہیں
زندہ رہنے کا وہ انسان سزا وار نہیں
جو حسینیؑ بھی ہے اور موت سے بھی ڈرتا ہے
ہاں! وہ توہین حسین ابن علیؑ کرتا ہے

علمائے سوء سے بھی سوال کرتے ہوئے جوشؔ پر وقار نظر آتے ہیں اور انھیں متنبہ کرتے ہیں:

میں یہ پوچھوں جو خفا ہوں نہ رفیقانِ کرام
کہ لرزتے تو نہیں آپ حضورِ حکّام
آپ سرکار ہیں جھکتے تو نہیں بہر سلام
آنکھ شاہوں سے ملاتے ہیں بہ انداز امام

رائے بکتی تو نہیں آپ کی بازاروں میں
آپ کا رنگ تو اڑتا نہیں درباروں میں

جوشؔ ''کربلا'' کو مستقل انقلاب کی علامت قرار دیتے ہیں:۔

کربلا ایک تزلزل ہے محیط دوراں
کربلا خرمن سرمایہ پہ ہے برق تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربت آواز ازاں
کربلا جرأت انکار ہے پیش سلطاں
فکر حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجود اشرار
دوش انساں پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرم پیکار
کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار
کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

صلح کل، عالمی برادری، امن و آشتی، سماجی مساوات اور رواداری کا پیغام مراثیٔ جوشؔ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ انسانی تہذیب وتمدن اور اس کی زندگی کی بقا کے لیے بھرپور سعی نظر آتی ہے:۔

اے دوست سعیٔ امن سے ہو شادو با مراد
انسان کے دماغ کا سرطان ہے عناد
روح بشر کی موت ہے خونخواری و فساد
اپنے غضب سے جنگ ہے سب سے بڑا جہاد
لاکھوں میں بے نظیر، کروڑوں میں فرد ہے
جو مسکرائے طیش میں، بے شک وہ مرد ہے

جوشؔ نے سعیء امن سے شاد و بامراد ہونے کی بات تو ضرور کی ہے لیکن جب تہذیب و تمدن انسانی پامال ہونے لگے تو شمشیر بکف ہونے کے لیے بھی آمادہ کرتے ہیں:۔

پھر تمدن کی طرف پھنکارتا ہے ایک ناگ
جل رہا ہے پھر عروس زندگانی کا سہاگ
کانپتی راتیں صدائیں دے رہی ہیں آگ آگ
جاگ اے ابن علیؑ کے نوحہ خوان خفتہ جاگ

اٹھ بھڑکتی آگ کو پانی بنانے کے لئے
کربلا آئی ہے بالیں پر جگانے کے لئے

عامتہ الناس اور دشمنوں کے لئے بھی جوشؔ عام انسانی اخلاقی قدروں کی پاسداری، تحفظ آدمیت کے لئے لازم قرار دیتے ہیں اور سیرت مولا کے متقیان کی روشنی میں تمام عالم کو متوجہ کرتے ہیں:۔

قاتل بھی ہو رہا ہو اگر پیاس نڈھال
پانی اسے پلا کہ یہی ہے رہ کمال
دشمن بھی گر رہا ہے تو ہاں دوڑ کر سنبھال
تھوکے بھی کوئی منھ پہ تو ماتھے پہ بل نہ ڈال

دل کی سپر پہ غیظ کا ہروار روک لے
تار نگاہِ لطف پہ تلوار روک لے

جھکتا فتنہ عفو و ترحم کے سامنے
گھٹتا ہے طعنہ، حسن تکلم کے سامنے
تھمتا ہے شور، جنگ ترنم کے سامنے
تلوار کانپتی ہے، تبسم کے سامنے

بدلے کی رسم دین وفا میں حرام ہے
احسان ایک شریف ترین انتقام ہے

جوشؔ عداوت کے شدید ماحول میں بھی معیار شرافت کے نقیب ہیں:۔

ہمدم ہو یا حریف کسی کو سمجھ نہ غیر
ہر آن جوئے مرحمت و آشتی میں پیر
لیکن یہ امر اے دل حق بین و عرش سیر
شخصی معاملات کی حد تک ہے امر خیر
نوعی معاملات کا انداز اور ہے
اس انجمن کے ساز کی آواز اور ہے

انفرادی اور شخصی معاملات میں عفو و کرم، چشم پوشی وغیرہ تو جائز ہے لیکن جہاں عالم انسانیت اور دنیائے آدمیت، فتنہ و فساد کی زد پر آ جائے اس وقت مہر و محبت کی خو، جوشؔ گناہ قرار دیتے ہیں اور اس وقت پائے ہوس سے طاقت رفتار کھینچنے اور میدان میں نیام سے تلوار کھینچ لینے کی ترغیب دیتے ہیں اور جوشؔ میر کربلا کو آواز دیتے ہیں:۔

ہاں جوشؔ اب پکار کہ اے میر کربلا
اس بیسویں صدی کی طرف بھی نظر اٹھا
ہاں دیکھ یہ خروش یہ ہلچل یہ زلزلہ
اب سینکڑوں یزید ہیں کل اک یزید تھا
طاقت ہی حق ہے شور ہے یہ گاؤں گاؤں میں
زنجیر پڑ رہی ہے پھر انساں کے پاؤں میں

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج کے اس صنعتی اور تمدنی دور میں فتنہ و فساد کی جتنی بھی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں، انسانیت پر پوری طرح مسلط ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین اور مدبرین اس تباہی عالم سے کافی پریشان اور متفکر ہیں۔ اخبارات و رسائل اور موقر جرائد میں ان کے بیانات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اس عالم گیر و ہمہ گیر بران وفساد کے حل کے متلاشی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کہیں سے مذہب کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ کہیں سے انسانیت کے نام پر بھائی چارگی کی دعوت دی جاتی ہے۔ کوئی معاشی نظام کی طرف بلاتا ہے۔ کوئی انتہائی سنجیدگی سے ''ایک

حکومت'' کا نعرہ لگاتا ہے۔ کوئی معاشی عدم توازن کو سبب فساد قرار دے کر کمیونزم کو حل کے طور پر پیش کرتا ہے اور کوئی سرمایہ دارانہ جمہوریت کو تریاق قرار دیتا ہے......... لیکن تاریخ عالم گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی موجودہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی قیادت جن کے ہاتھوں میں ہے جو امن کے ذمہ دار بنے بیٹھے ہیں ان سب کے دماغ و دل ماؤف اور فکر و عقل معطل ہیں۔ اور خود ساختہ ضامن امن عالم خود فساد کا سبب ہیں۔ ایسے عالم میں جوشؔ کے مراثی ہماری رہنمائی کرتے ہیں جو ایک ایسے رہبر حق کی نشاندہی کرتے ہیں جو مذہب و ملت مشرق و مغرب اور سنین و شہور سے بلند تر ہو کر پیغام امن اور مژدۂ انسانیت دے رہا ہے۔

رو ہے وہ حرص کی کہ ٹھکانے نہیں ہیں ہوش
بھٹکے ہوئے انا پہ معلق ہیں چشم و گوش
پھر آدمی ہے صلح نما و جدل فروش
سینے خزف بدست ، زبانیں گہر بدوش
آ، اور زلف لیلیٰ ہستی سنوار دے
ڈوبی ہوئی ہیں وقت کی نبضیں ابھار دے

یا

پھر حیات نوع انسانی ہے، کجلائی ہوئی
گل پڑے ہیں ولولے جرأت ہے، مرجھائی ہوئی
پھر زمین و آسماں پر موت ہے، چھائی ہوئی
موت بھی کیسی خود اپنے ہات کی لائی ہوئی
چہرۂ امید کو رخشندگی دے، یا حسینؑ
زندگی دے زندگی دے زندگی دے یا حسینؑ

☆☆☆

جوشؔ اور غزل

لطف الرحمٰن

جوشؔ بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا، بعد میں انہوں نے غزل گوئی ترک کر دی۔ نظم نگاری کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ غزل کے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ ایک ممتاز نظم نگار کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ ان کے فوراً بعد کی نسل نے ان کے گہرے اثرات قبول کیے۔ غزل کی مخالفت میں انہوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ غزلیہ روایات کے سحر سے کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ ان کی تمام تر کامیاب نظمیں غزلیہ رنگ و آہنگ سے مملو ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا حسن بھی ہے اور قبح بھی۔ خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ ان کے تمام نقادوں کی کم و بیش یہی رائے ہے۔

یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ جوشؔ کا تخلیقی باطن غزل سے ہم آہنگ تھا۔ ان کی ذہنی تربیت کلاسیکی روایات کے زیر اثر ہوئی تھی۔ عزیزؔ لکھنوی سے انہیں تلمذ تھا۔ تقریباً چھ سال تک یہ رشتہ برقرار رہا۔ عزیزؔ غزل کے مستند اساتذہ میں تھے، ان کے مشہور شاگردوں میں اثر لکھنوی، جگت لال رواں اور جوشؔ ہیں۔ عزیز کی تربیت نے بھی جوشؔ کو کلاسیکی رموز و نکات سے آشنا کیا۔ جوش اس کے معترف ہیں۔

> ''اس میں شک نہیں کہ حضرت عزیزؔ بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے۔ جہاں تک زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے، ان کی

ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا۔''

یادوں کی برات ص ۱۲۹

عزیؔز صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ صفی جدید شاعری کے علم برداروں سے متاثر تھے۔ لکھنوی طرز شاعری سے انہوں نے کنارہ کشی کی۔ مصلحین غزل کے زیر اثر غزل میں نئے رجحان و میلان کے فروغ میں حصہ لیا۔ اور معیار پارٹی کے تحت دہلی کے طرز سخن کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔ عزیؔز نے بھی استاد کے زیر اثر اس انقلاب کے اثرات قبول کئے، جس کی شہادت ان کے مجموعۂ کلام ''گلکدہ'' سے ملتی ہے۔ انہوں نے میؔر و غالؔب کے امتزاج سے مذاق جدید کو ہم آہنگ کیا اور اپنے کلام کو حسن، تازگی اور معنی آفرینی بخشی۔ ان کے درج ذیل اشعار شہرۂ آفاق ہیں۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

======

دیکھ کر نظم دو عالم ہمیں کہنا ہی پڑا
یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا

======

دیکھ کر ہر درو دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

======

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

======

کب اکیلے اس جہاں سے ہم گئے
لے کے اپنے ساتھ اک عالم گئے

جوؔش کا سن پیدائش ۱۸۹۶ء ہے۔ انہوں نے ۹ برس کی عمر سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اس

جہت سے ان کی شاعری کی ابتدا کا زمانہ ۱۹۰۵ء ہے۔ 'روح ادب' ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، جس میں ۱۹۲۰ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس مجموعے میں ان کی پندرہ سالہ شعری کاوشیں یکجا ہوگئی ہیں۔ اس میں ابتدائی دور کی غزلیں بھی ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ 'شعلہ و شبنم' ہے۔ سن اشاعت ۱۹۳۶ء ہے۔ اس میں بھی غزلیں ہیں۔ جنہیں جوش نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک کی غزلیں ''قدیم رنگ تغزل'' کے زیر عنوان ہیں۔ بعد کی غزلیں ''جدید رنگ تغزل'' سے موسوم ہیں۔ جن کا آغاز درج ذیل رباعی سے ہوتا ہے۔

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوب سخن نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

جوش نے 'یادوں کی برات' میں اپنے پہلے مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ تین اشعار بھی درج کیے ہیں جنہیں بے پناہ داد کا مستحق سمجھا گیا تھا۔ اشعار ذیل میں درج ہیں۔

اے نسیم صبح کے جھونکو یہ تم نے کیا کیا
میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں
میری آنکھیں جانتی ہیں، کرب افراط خوشی
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہو گئیں
ہائے میری مشکلوں نے بھی کیا دھوکا دیا
عین دلچسپی کا عالم تھا کہ آساں ہو گئیں

'روح ادب' کی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے۔

نہیں معلوم کیا کھوئی ہوئی شے یاد آتی ہے
ہوا جب سرد چلتی ہے، کلیجہ تھام لیتے ہیں

======

مجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا

خدا وہ ہے جو حد عقل میں آہی نہیں سکتا
رموز معرفت کو معنی بے لفظ کہتے ہیں
یہ وہ باتیں ہیں، جن کو ناطقہ پا ہی نہیں سکتا

======

نظر نے پا لیا ہے انتہائے عیش فانی کو
خوشی کے نام سے اب درد اٹھتا ہے مرے دل میں

======

کبھی سن لے ارے او ساز عشرت چھیڑنے والے
عجب آواز آتی ہے مرے ٹوٹے ہوئے دل سے

'شعلہ و شبنم' میں قدیم رنگ تغزل کا نمونہ ملاحظہ کیجئے

جہاں تھا داؤد سا مغنی، جہاں تھی یوسف سی شمع رنگیں
اسی شبستاں میں بہر نغمہ ہوا ہے اب انتخاب میرا
ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
صبا تصدق ترے نفس پر، چمن تیرے پیرہن پہ قرباں
شمیم دوشیز گی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

======

زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو
آیا ہے کوئی اپنا پتہ پوچھتا ہوا

======

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں
بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

======

اے ساکنان دیر و حرم ! کہہ رہے ہو کیا
باہر کھڑے ہیں حلقۂ دنیا و دیں سے ہم

======

صبح کی کرنیں جگا ہی دیں گی خواب ناز سے
رات نے کلیوں کی دم بھر آنکھ جھپکائی تو کیا
اصل کی جانب جھکا دے گی زمانے کی ہوا
پنکھڑی بن کر چمن کی خاک اترائی تو کیا

======

یہ عجیب رنگ ہے مئے کشو کہ ہر ایک چہرے پہ نور تھا
یہ گماں ہے مجھ کو گزشتہ شب کوئی مست تم میں ضرور تھا
میں تڑپ کے حسن کو پا گیا، وہ چمک کے خاک میں مل گیا
میں شہید جلوۂ بے خودی ، وہ ہلاک رنگ شعور تھا
مرے سامنے تھا وہ جلوہ گر، اسے پا سکی نہ مری نظر
یہ ضیائے کثرت جلوہ تھی ، یہ ہجوم شان ظہور تھا
یہ صبا نے خاک اڑائی کیوں، یہ چٹک کے غنچے نے کیا کہا
مجھے وہم ہوتا ہے ہم نوا، کوئی بھید اس میں ضرور تھا

اور اب جدید رنگ تغزل کا انداز ملاحظہ کیجئے

سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

======

اللہ رے حسن دوست کی آئینہ داریاں

اہل نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا
مجھکو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرور عشق نے انکار کر دیا

======

جہاں ہے شوق وہاں کیف وکم کی بات نہیں
دیار عشق میں دیر و حرم کی بات نہیں

======

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمی بازار نہ ہوتا

======

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکرا تا جا
چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا

======

پنہاں تھیں جس میں روح کی گہری خموشیاں
اس جنبش نظر کو غزل خواں بنا دیا

======

دنیا نے فسانوں کو بخشی، افسردہ حقایق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا فسانوں کا

======

ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار
لے سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

======

اے کلی ناز سے کھل، بادۂ سر جوش ابل
کہ نگار چمن و شاہد مستاں آیا

======

چلا ہے سوئے حرم دل سے ساز کرتا جا
طواف کعبۂ حسن مجاز کرتا جا
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور
جفائے طول شب انتظار کرتا جا

جوشؔ کی غزلوں میں وعدۂ فردا کا رنگ و آہنگ موجود ہے۔ اگر انہوں نے ترک غزل گوئی نہ کی ہوتی تو اس میدان سخن میں یقیناً امتیاز حاصل کرتے۔ ان کے سامنے اقبالؔ کی مثال تھی۔ جنہوں نے نظم اور غزل دونوں صنفوں میں اپنے ابدی نقوش ثبت کئے۔ مگر جوش اضطراری مزاج رکھتے تھے، جس کا اعتراف انہوں نے خود نوشت میں کیا ہے۔ ان کے بعض نقادوں نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے لفظوں میں:

"............جوشؔ کی شخصیت میں سیمابیت اور جلد بازی شروع ہی سے رہی ہے۔ مذہب یا پرانی اقدار کے خلاف ان کی بغاوت کی بنیاد سطحی اور جذباتی ہے۔ اس کا مسلسل غور و فکر، مشاہدہ اور ذہنی ارتقا کے ایک جدلیاتی عمل سے تعلق نہیں ہے۔"

فکر و فن ص ۳۵۔۱۳۴

یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے۔ جوشؔ نے اپنی ترک غزل گوئی کی جو وجہ بیان کی ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جوش کے مطابق وحیدالدین سلیم نے انہیں نظم گوئی کی طرف راغب کیا۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

".....سب سے پہلے انہیں بذرگوار نے مجھے توجہ دلائی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی تغزل پر مرحوم ہی نے اس قدر قہقہے مارے تھے کہ میرے دل کو اس

غیر فطری صنف سے پھیر دیا۔''

جوش شناسی ص ۴۱

اس حادثے کے بعد جوش نے غزل گوئی ترک کر دی۔ وحیدالدین سلیم کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا لیکن جوش ۱۹۳۶ء تک غزل کہتے رہے۔ 'شعلہ و شبنم' کی غزلوں کا ذکر آچکا ہے۔ اس کا سن اشاعت ۱۹۳۶ء ہے۔ وحیدالدین سلیم کی قہقہہ بازی کے بعد بھی جوش غزل سرائی کرتے رہے مگر بعد میں غزل گوئی ترک کر دی۔ ترک غزل گوئی کے یقینی سال کا پتا نہیں۔ لیکن ایک اشتباہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں اقبال کے انتقال کے بعد یہ حادثہ ہوا۔ اقبال کے انتقال سے اردو شاعری میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔ اردو کے تمام معروف نظم گو شعرا سرور جہاں آبادی ۱۹۱۰ء، نوبت رائے نظر ۱۹۲۳ء، چکبست لکھنوی ۱۹۲۶ء، نادر کاکوروی ۱۹۱۲ء، ریاض خیر آبادی ۱۹۳۴ء میں رخصت ہو چکے تھے۔ جوش نے اقبال کو اپنا موڈل نہیں بلکہ حریف سخن سمجھا۔ رشید خاں کے مطابق:

''جوش نے کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف تو نہیں کیا۔ لیکن ہے یہ واقعہ کہ وہ اقبال کو اپنا حریف سمجھتے تھے اور یہ غلط اندیشی اور غلط فہمی کی دوسری انتہا تھی۔ اقبال اور جوش میں وہی نسبت تھی جو مثلاً ذوق اور مرزا غالب میں ہو سکتی ہے۔ زمین اور آسمان کا فرق۔''

جوش شناسی ص ۸۴

۱۹۳۸ء عالمی سطح پر انتشار و بحران کا زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک مقبولیتوں سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ آزادی کی مختلف تحریکات انقلاب کا پیش خیمہ تھیں۔ جوش اچانک اشتراکی بن گئے۔ بغاوت اور انقلاب ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

لیکن وہ زندگی بھر بغاوت اور انقلاب میں تمیز نہ کر سکے۔ ڈاکٹر وحید اختر لکھتے ہیں۔

''میں جوش کو، باوجود اس کے کہ وہ فرماتے ہیں۔ ''میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب'' انقلابی شاعر نہیں سمجھتا۔ انقلابی اور باغی میں فرق یہ ہے

کہ انقلابی کسی سیاسی نظریے اور تعمیری پروگرام کا پابند ہوتا ہے جب کہ باغی محض موجودہ نظام کی تخریب کا نعرہ لگاتا ہے، جوشؔ کی پوری انقلابی شاعری کسی گہرے انقلابی شعور سے عاری ہے۔''

ایضاً ص۴۳

مجنوںؔ گورکھپوری نے سب سے پہلے جوشؔ کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''جوشؔ کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ ایک کف دردہاں چیخ سے زیادہ وقیع نہیں۔ جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے۔''

فکروفن ص۴۲۔۱۴۱

جوشؔ کی انقلابی اور سیاسی نظموں پر کلیم الدین احمد، پنڈت کشن پرشاد کول، آل احمد سرور، ملک راج آنند، عزیز احمد، فیض احمد فیضؔ وغیرہ کی رائے کم وبیش یکساں ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کی یہ رائے دعوت فکر دیتی ہے:

''جوشؔ انقلاب کی تحریک میں جذباتی طور پر شریک ہوتے ہیں اور بعد میں چل کر اپنے آپ کو اشتراکی کہنے لگتے ہیں لیکن اشتراکیت سے ان کا تعلق محض رومانی ہے۔ اس لئے آگے چل کر ان کی شاعری خود اشتراکی نظریۂ انقلاب کی تکذیب کرنے لگتی ہے۔ اور بقول فیض احمد فیضؔ غیر انقلابی اور غیر اشتراکی ہو جاتی ہے۔''

فکروفن۴۴۔۱۴۳

انتہا تو یہ ہے کہ جوش اپنی جذباتی رو میں اکثر متضاد فکروخیال کے شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ دعویٰ تو انقلابی ہونے کا کرتے ہیں۔ متحدہ قومیت پر ان کا ایمان ہے۔ مسلم لیگ کے کٹر مخالف ہیں۔ لیکن رشید حسن خاں کے تجزیے کے مطابق:

''ان کی نظم ''وقت کی پکار'' مختلف انداز نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ اس نظم میں دوقومی نظریے، تقسیم وطن اور قیام پاکستان کے اتنے ہی پرجوش حامی اور مبلغ نظر آتے ہیں، جتنا لیگ کا کوئی نظریہ ساز ہو سکتا ہے۔''

جوش شناسی ص ۸۵

جوش کے مزاج میں ابتدا ہی سے لا ابالی پن، جلد بازی اور والہیت رہی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کے تجزیے کے مطابق:

''علمی تہی مائیگی، سیمابیت اور جاگیردارانہ عیش پرستی ان تینوں کا مرکب جوش کی شخصیت ہے۔''

فکر و فن ۱۳۵

بہ الفاظ دگر جوش کی شخصیت و شاعری تضاد کی حامل تھی، جس کی وجہ سے ان کے یہاں نہ آفاقیت پیدا ہو سکی نہ ابدیت، جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ جوش نے بزعم خود اقبال سے حریفانہ رشتہ رکھا۔ لیکن کلیم الدین احمد نے ان کی متعدد مقبول ترین نظموں کو اقبال کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے۔ اقبال کی مشہور فارسی نظم جس کا پہلا بند درج ذیل ہے۔

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراج غماں خیز
از نالۂ مرغ چمن از بانگ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
ازخواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

ازخواب گراں خیز

کے زیر اثر جوش نے متعدد نظمیں لکھیں۔ اسی طرح اقبال کی فارسی نظم ''حدی'' (نغمہ سار بان حجاز)

ناقۂ سیار من
آہوئے تاتار من
درہم و دینار من
دولت بیدار من
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

کا چربہ بھی جوش نے اتارا۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اس طرح کی متعدد مثالیں جوش کے

یہاں موجود ہیں جن سے اقبال کی بھونڈی تقلید نمایاں ہے۔ وہ اقبال کے حریف تو کیا ہوتے ان کے معتبر مقلد یا پیرو بھی نہ ہو سکے۔ عزیز احمد نے ترقی پسند ادب میں جوش کے متعلق لکھا ہے: ان کے بلند کو میں بغایت بلند تو نہیں کہہ سکتا مگر پستش بغایت پست کا اطلاق ان پر یقیناً ہوتا ہے۔

جوش کی اس تخلیقی بے راہ روی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذوق شعری کے بنیادی تقاضوں کو محض اپنے لا ابالی پن میں نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ نظم اور غزل ہر دو صنف کو ذریعۂ اظہار بناتے تو ان کی نظم نگاری بھی نسبتاً زیادہ تخلیقی حسن کی حامل ہوتی۔ انہوں نے اقبال کی روایت سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اقبال نے غزل اور نظم ہر دو صنف میں خارجی اور داخلی سطحوں پر انقلاب برپا کیا۔ اقبال کا تخلیقی تخیل حقیقت ہستی کے سربستہ رازوں کو لفظوں کا عرفان بخشنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ جوش اس صلاحیت سے محروم تھے۔ وہ لفظوں کو اظہار کا وسیلہ سمجھتے تھے جذبات کا بے ہنگم اظہار۔ غزل کی مخالفت میں وہ شمشیر برہنہ ہو کر سامنے آئے۔ بدترین مخالفوں میں شمار کئے گئے۔ لیکن زندگی بھر غزل کے سحر سے دامن نہ بچا سکے۔ انہوں نے اپنے نثری مقالات یا یادوں کی برات میں سینکڑوں فارسی اور اردو کے اشعار اور مصرعے مقتبس کئے ہیں اور یقیناً موقع محل کی مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔ جس نے ان کی نثر میں حسن و تاثر پیدا کیا ہے لیکن شعوری طور پر وہ عظمت اللہ خاں کی طرح غزل کی گردن اڑا دینے کے حق میں تھے۔ یہی تضاد فکر و احساس ان کی تخلیقی شخصیت میں حجاب بن کر حایل رہا۔ ڈاکٹر فضل امام کے مطابق:

> ''جوش نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور غزل کے شدید مخالف اور نکتہ چیں ہونے کے باوجود غزل اور انداز غزل سے دامن نہیں چھڑا سکے۔''

شاعر آخر الزماں۔ جوش ملیح آبادی ص ۷۶

ڈاکٹر وحید اختر نے بھی اسی بنیاد پر ان کو اردو کا آخری کلاسیکی شاعر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جوش نے غزل کو غیر فطری صنف سخن سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن نظم میں وہ ہیت کی پابندی اور قافیہ و ردیف کے لزوم کو فطری سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ان کی تمام تر نظمیں پابند ہیں۔ جوشؔ اسی مفہوم میں کلاسیکیت کے شاعر ہیں۔''

جوش شناسی ص ۴۴

جوشؔ نے اپنی نظموں میں کوئی ہیئتی تجربہ نہیں کیا ہے۔ قصیدہ، مسدس اور مثنوی کی ہیئتیں ان کی پسند ہیں۔ رباعی بھی ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ مگر ہر ہیئت میں ان کی وہی نظمیں زیادہ مقبول ومشہور ہیں جو تغزل کے زیر اثر ہیں۔ غیر شعوری طور پر وہ غزل کے قتیل ہیں۔ شعوری طور پر قاتل۔ یہی تضادِ فکر و احساس ان کی تخلیقی معراج کی راہ میں حایل ہوا ورنہ ان کے شعری امکانات کی فراوانی کا ہر نقاد قایل ہے۔

جوشؔ کی ترکِ غزل گوئی تو ایک تخلیقی سانحہ تھی ہی۔ وحید الدین سلیم کے بے ہنگم قہقہوں کی زائیدہ غزل سے ان کی مخالفت بھی ایک اضطراری عمل تھا۔ اپنے مضمون ''غزل گوئی'' میں انہوں نے دو سوالات اٹھائے ہیں۔

(۱) کیا غزل مصنوعی اور جھوٹی شاعری کا آلۂ کار نہیں؟

(۲) کیا غزل گویوں کو صحیح معنوں میں شاعر کہا جا سکتا ہے؟

جوشؔ نے ان دونوں سوالات کے جواب کے لئے پہلے شاعری کیا ہے؟ پھر شاعری کسے کہتے ہیں؟ کے مسئلے پر اپنی رائے پیش کی ہے جو ناپختہ، غیر منطقی، اور سرسری خیالات کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان مسئلوں پر جوشؔ علمی و فکری مباحث کی صلاحیت سے عاری ہیں۔

بہر کیف! اس کے بعد وہ غزل اور غزل گو شعرا کی تخفیف و تحقیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱)....ہماری طرحی اور طبع زاد دونوں قسم کی غزلیں جذبے اور تاثر کے تحت نہیں بلکہ محض الفاظ کی خاطر کہی جاتی ہیں۔

مقالات جوش ص ۲۷

(۲) ہماری غزلیں تو محض الفاظ کی بازیگری اور شاعری کی نقالی کے نمونے ہیں ان کو شعر و شاعری سمجھنا اپنی سخن سنجی کو رسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

ایضاً ص ۲۷

(۳) کیا ان کی شاعری حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نگاہی کہی جا سکتی ہے؟ کیا ان شعرا کو ہم ''مصور حیات'' اور ''مورخ عصر'' کا خطاب دے سکتے ہیں۔

ایضاً ص ۷۷

(۴) یہ چیزیں تو بہت بڑی ہیں۔ ان غریبوں کے کلام موزوں سے تو پتا تک نہیں چلتا کہ یہ کس عہد میں پیدا ہوا، اور وہ کس زمانے میں مرا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام شعرا ایک ہی زمانے میں موجود تھے۔ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ ایک ہی غسل خانے میں نہاتے اور ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے۔ ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی لانبے تکئے پر سب کے سب سر رکھ کر سوتے تھے اور ایک ہی دن سب بیدار ہوتے تھے اور ایک ہی دن سب کے سب مر گئے تھے۔ یہ ہیں ہمارے ''مصوران حیات''۔ یہ ہیں ہمارے ''مورخان عصر'' ہمارے شعرائے جلیل وکبیر۔

ص ۷۸۔۷۷

(۵) کیا میری قوم ایک لمحے کے لئے غور کرے گی کہ غزل کو باقی رکھنے میں کتنا ادبی نقصان اور کس قدر سیاسی خطرہ ہے۔

مقالات جوشؔ۔ مرتبہ سحر انصاری ص ۷۸

(۶) ہمارے ادبیات میں ہے کیا؟ وہی روایتی، مصنوعی اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے، وہی ناروا قناعت اور ترک دنیا کے چبائے ہوئے نوالے وہی ''اگر شبہ روز را گوید شب این ست'' کی غلامانہ تعلیم، وہی ''ما مقیمان کوئے دلداریم'' کی لوریاں۔ وہی۔ ''گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے'' کی بزدلی۔ وہی ''رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحانے مرا'' کی کفن فروشیاں۔ وہی ''یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا، کی بولی ٹھولی'' وہی ''ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا'' کی کاہلانہ بے پروائیاں۔ وہی۔ ''لے شب وصل غیر بھی کاٹی'' کی بے غیرتیاں، وہی ''ایسے میں کوئی چھم سے

آجائے تو کیا ہو'' کی سوقیانہ بول چال ۔ وہی ۔''اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے'' کی زبوں ہمتی ۔ وہی ۔'' کارساز مابہ فکر کار ما'' ۔ کی خواب آور دوائیں اور وہی ۔''بہت سعی کیجئے تو مر رہئے میر، بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے ۔ کی نسائی ناچاریاں ....''

ص ۶۰۔۵۹

جوش اسی پر بس نہیں کرتے ۔ انہیں غزل گو شعرا کے تخلص سے بھی بغض للّہی ہے ۔ لکھتے ہیں:

''کہاں تک رووٴں؟ کس کس بات کا ماتم کروں؟ ذرا اپنے شعرائے کرام کے تخلص ہی ملاحظہ فرمالیجئے اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں اس کا جواب کیا ہوگا؟''

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دے گا کہ اس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جن کے ولولوں کی کمریں ٹوٹ چکیں اور جن کی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں ۔

سنئے اور عبرت کے کانوں سے سنئے ۔

مجروح، تفتہ، ملول، مسکین، دود، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، عدم، بیدم، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق اور یاس وغیرہا۔

اور لگے ہاتھوں ان شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے ان سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں ۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، رسوا، کمترین، فدوی، عبد، ذلیل، ہیچ میرز بندۂ بے نوا، کمترین خلائق، اذل مخلوق، احقر العباد، عاجز، ہیچمد اں، گناہگار، عاصی، پر معاصی اور روسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلبگار ہیں ۔''

ص ۶۱

ایسی متعدد مثلایں جوش کے نثری مضامین میں موجود ہیں جو غزل اور کلاسیکی شاعری کی تخفیف و تنقیص کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی جوش ہیں، کبھی جن کا یہ دعویٰ تھا

آج اے جوش ترے رنگ غزل گوئی سے

قند پارس کا مزہ ہے بہ زبان اردو

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ خود جوش کی شاعری عصری فضا میں سانس لینے کے باوجود انہیں کلاسیکی روایتوں کے زیر اثر ہے۔ کلیم الدین احمد کے درج ذیل خیالات دیکھئے:

(۱) ''جوش کی بیشتر نظمیں حقیقت میں نظمیں نہیں ۔ یہ غزلیں ہیں جو نظم کا بھیس بدل کر نکلی ہیں۔''

ص ۱۴۰

(۲) ''جوش کی فطری نظمیں بھی ان نقائص سے بری نہیں جو عام طور پر اردو شعرا میں پائے جاتے ہیں۔ نظم کے بھیس میں یہاں بھی اکثر غزلیں نظر آتی ہیں۔ طوالت، قافیہ پیمائی، معنی آفرینی محض یہ سب نقائص موجود ہیں۔''

ص ۱۴۴

جوش کا المیہ یہ ہے کہ جس کلاسیکی طرز اور روایت تغزل کے خلاف انہوں نے زندگی بھر جہاد مسلسل کیا، وہی طرز و اسلوب ان کی شاعری کی تخصیص بھی ہے اور شناخت بھی۔ عصری فضا میں سانس لینے کے باوجود بنیادی طور پر کلاسیکی مزاج اور متغزلانہ لب و لہجہ رکھتے ہیں اور یہ کوئی عیب نہیں۔ غزل اردو کی بنیادی صنف سخن ہے۔ اختصار و ایجاز اس کا حسن ہے Sense of Brevity اس کی تخصیص ہے۔ اقبال اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ 'فلسفہ عجم' میں رقم طراز ہیں:

''میرے خیال میں ایرانی ذہن تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں قوت منتظمہ کا فقدان ہے۔ جو عام تصورات کو بتدریج تشکیل دیتی ہے......... ایرانیوں کا تتلی کا سا بیتاب تخیل گویا ایک نیم مستی کے عالم میں ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف اڑتا پھرتا ہے اور وسعت چمن پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنے کے نا قابل نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے

گہرے سے گہرے افکار و جذبات غیر مربوط اشعار غزل میں ظاہر ہوتے
ہیں جو اس کی فنی لطافت کا آئینہ ہیں۔''

(فلسفۂ عجم، ص ۱۰۔۹۔ ترجمہ حسن الدین)

اقبال کی نگاہ میں جو شئے فنی لطافت کا آئینہ ہے وہی جوش اور دیگر مخالفین غزل کی نظر میں قابل گردن زدنی ہے۔ حالانکہ اقبال، جوش، جمیل مظہری، فیض اور دیگر تمام نظم نگار شعرا کی کامیاب، مقبول اور مشہور نظمیں تغزل کے حسن سے مملو ہیں۔ اقبال کا مجموعۂ کلام ''ضرب کلیم'' ان کے منضبط افکار و خیالات کا گراں قدر اظہار ہے لیکن اس کو خشک اور کسی حد تک بے نمک قرار دیا جاتا ہے۔ الزام یہ ہے کہ اس میں شعریت کی کمی ہے۔ ایک ہی مصرعہ:

اک شوخ کرن شوخ مثال نگۂ حور

بقول بعض ناقدین شعریت کا حسن رکھتا ہے۔ بقیہ پوری کتاب منظوم فلسفہ ہے۔ اس کے مقابلے میں ''بال جبریل'' زیادہ لائق تحسین ہے کہ اس میں شعریت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شعریت یعنی تغزل۔ شعریت یا تغزل کی کمی نظم کو اثر و تاثیر کے حسن سے محروم کر دیتی ہے۔ نظم ہی نہیں کسی بھی شعری تخلیق کی کامیابی کے لئے شعریت ناگزیر ہے۔ جوش کی نظموں میں شعریت کا حسن موجود ہے۔ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ربط، تنظیم، ارتقا اور مرکزی خیال کی کمی تکنیکی معاملہ ہے جس کی گرفت ان کے نقادوں نے کی ہے۔ لیکن ان کی کامیاب اور مشہور و مقبول نظمیں شعریت کا لازوال حسن رکھتی ہیں، یہی ان کا امتیاز ہے۔ ان کی انفرادیت ہے۔ جس کی انہوں نے زندگی بھر مخالفت کی۔ جو ان کی سیمابی شخصیت کا منفی ردعمل ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے تخلیقی باطن میں ایک ممتاز غزل گو ہمیشہ موجود رہا ہے۔

☆☆☆

جوش: ایک مفکر شاعر

اقبال حیدر

جوش سے زیادہ متنازعہ شاعر کم از کم اردو ادب میں تو نہیں۔ بادی منظر میں کچھ لوگوں کو ان کی شاعری تضاد کا شکار نظر آتی ہے۔ مگر اس بات کو ذرا سا مختلف انداز سے دیکھیں تو یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی علم بیزاری و سہل پسندی کی وجہ سے بغور تو چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہی نہیں۔ ہم نے تو ابتک یہ زحمت بھی نہیں گوارا کی کہ ''منطقی جدلیات'' اور ''منفی تضادات'' کے فرق کو جاننے کی کوشش کرتے۔ بہر حال جوش کے سلسلے میں ایک بات تو یقینی ہے کہ ان کے ناقدین اور پرستار دونوں ہی کسی نہ کسی انتہا (Extreme) پر ہی نظر آتے ہیں۔ فراق گورکھپوری سے لے کر ایک عام قاری تک ہزاروں ایسے مل جائیں گے جو انہیں شاعر اعظم کا درجہ دیتے ہیں اور دوسری جانب کم و بیش اتنی ہی بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوگی جو انہیں ایک عام سا شاعر سمجھتے ہیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا اگر ان دونوں متضاد رویوں کا معروضی اور تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

دراصل ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جوش صاحب کا اردو ادب میں کیا مقام ہے مگر دشواری یہ ہے کہ جوش کو پرکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ان جیسا متحرک (Dynamic) دماغ، بسیط نگاہ، جری اور بے باک مزاج اور سب سے بڑھ کر اتنا گھمبیر (profound) اور کثیر اسلوب (Multi-Dictional) شاعر اپنے قاری اور ناقد سے جس مشقت، دیدہ ریزی اور سنجیدگی کا متقاضی ہے وہ اب بڑی کمیاب ہے۔ ادھر یہ عالم کہ زندگی تیز رفتار، آدمی سہل طلب اور معاشرہ زوال

پذیر۔بات بنے تو کیسے بنے۔

جوش اردو شاعری کے اس موڑ پر آئے جب ہندوستانی تہذیب کی سانسیں اکھڑ چکی تھیں، بیرونی قوت اپنے قدم جما چکی تھی اور مشترکہ اقدار معاشرہ میں اپنا اعتبار بڑی تیزی سے کھو رہی تھیں۔ ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد کو پروپیگنڈے اور مختلف حیلے بہانے سے یہ باور کرادیا گیا تھا کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی در اصل غدر تھی۔ دو بڑی ہندوستانی اکائیوں کو آپس میں دست و گریباں کرانے کے عزائم بارآور ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بین الاقوامی سطح پر جنگ عظیم اول، ختم ہوتے ہوتے انسانی وقار کو مجروح اور انسانیت کو زخم خوردہ کر چکی تھی۔ غلام ہندوستان اپنا آپ ڈھونڈ رہا تھا اور سامراجی فرمانروا اپنی حکومت کو طول دینے کا جواز۔ مذہبی اور فرقے وارانہ فکر اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ ادبی افق پر ٹیگور اور اقبال جیسے giants چھائے ہوئے تھے کہ ایسے میں ایک نوجوان آواز ابھری جو سیکولر اور تازہ حسی عصریت لئے ہوئے تھی۔ اس آواز کا حوالہ مذہب یا عقیدہ نہیں تھا بلکہ انسان کا بنیادی و جبلی حق تھا، آزاد رہنے کا حق، آزاد فضا میں سانس لینے کا حق، اپنے فیصلے آپ کرنے کا حق، یہ آواز اسقدر توانا اور مختلف تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک متبادل اور متوازی فکری رجحان بن گئی۔ جوش کا پہلا مجموعہ روح ادب ان کے تابندہ تر تخلیقی مستقبل کی غمازی کر رہا تھا۔ دو تین شعر تبرکاً پیش کروں گا۔

دنیا بہت وسیع تھی لیکن مرے لیے
آزادیٔ خیال نے زنداں بنا دیا

دوسرے عالم میں ہوں عالم سے میری جنگ ہے
تاج شاہی سے قدم بھی مس کروں تو ننگ ہے

ہستی کی مملکت میں تباہی کا راج ہے
ہوشیار ہو کہ فرق مصیبت پہ تاج ہے

کسی شاعر یا آرٹسٹ کو پرکھنے کا اچھا پیمانہ یہ بھی ہے کہ اس کے Net

contribution کو جانچا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ اس نے کون سی نئی چیزیں، اسلوب، فکر اور حسّی رویوں سے ادب کو روشناس کرایا ہے۔ اس لحاظ سے جب جوش پر نگاہ پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایجادات کے ہم رکاب اور ہم پلہ بمشکل دو چار ہی ملیں گے۔ اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے چند مثالیں آپ کے پیش خدمت ہیں۔

ا۔ جوش اردو کے پہلے انحراف پسند یا منحرف شاعر ہیں (non conformist)۔

ب۔ جوش اردو نظم کے پہلے ایسے شاعر ہیں جو اپنے اسلوب کے بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔

پ۔ جوش اردو کے پہلے فری تھنکنگ شاعر ہیں۔ بیشتر قابل ذکر جدید اردو شاعری میں جوش ہی کی فکر کا عکس ہے۔

ت۔ جو[illegible] اردو کے پہلے اور شاید سردست آخری کثیر اسلوب multi dictional شاعر ہیں۔

ث۔ جوش نے اردو ادب میں حسن کا معیار بدلا ۔ حسن کی طبقاتی تقسیم کو چیلنج کیا اور اس کا فوکس بدلا۔

ج۔ [illegible]ـ اپنی نسل اور اپنے ماحول کی طرح جوش بھی تلذز پسند اور دل پھینک رہے مگر اس کے باوجود ان کی فنکارانہ دیانت نے اردو شاعری کی عورت کو اس کی دہری شخصیت سے نجات دلائی ورنہ ایک عورت اس کی زندگی میں پائی جاتی تھی اور دوسری اس کی شاعری میں۔

چ۔ جوش نے Perception-based شاعری نہیں کی۔ انہوں نے کبھی نقاد کا منہ نہیں تکا۔

ح۔ جوش نے اردو شاعری کو برہمی اور برافروختگی کے جذبے سے روشناس کرا کے اسے اعتبار بخشا اور زندگی کی جذباتی تکملیت سے قریب تر کیا۔

خ۔ جوش نے اپنی بے مثل قوت متخیلہ سے نئی نئی ترکیبوں، نابغۂ روزگار امیجری اور ستعاراتی نظام سے اردو شعری امکانات کو لامحدود اور فطرت نگاری کو متحرک اور لازوال بنا دیا۔

د۔ جوش نے اردو ادب کو للکاردی اور جبر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سکھایا۔

ذ۔ جوش اردو ادب میں مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کے بانی ہیں۔

ر۔ جوش نے انقلاب کو رومان اور رومان کو انقلاب بنا کر ایک زمینی حقیقت بنایا۔

ان چند مشاہدات کے بعد جی چاہتا ہے کہ جوش کی تین عظیم تر خوبیوں پر تفصیلی گفتگو کی جائے خصوصاً اس لیے کہ انہی اوصاف سے جوش کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے اور یوں بھی کہ ان حوالوں

سے جوش کے متعلق بہت سی بدگمانیاں پیدا کی گئیں یا پیدا ہوئیں۔

۱۔ جوش کا فکری paradigm اور فلسفہ جبر

۲۔ جوش کا تصور حسن اور عورت

۳۔ اسلوب جوش

۱۔ آرٹ کو زندگی کی نقالی (imitation) کہا جاتا ہے۔ آرٹ کے مختلف مظاہر اپنے لیے مناسب ذریعۂ اظہار (میڈیم) اختیار کرتے ہیں جیسے رنگ، شکل، گت، لے، دھن، آواز اور الفاظ۔ شاید یہ بات بڑی حد تک درست قرار پائے کہ آرٹ کی جتنی بھی اکائیاں ہیں شاعری ہی ان میں سب سے زیادہ Multi medial ہے۔ اس میں بسا اوقات، صوتی صوری اور معنوی حسن ملکر ایک ایسی تاثیر پیدا کرتے ہیں جو ابدی پرتو کا حامل ہوتا ہے۔ ہیئت یقینی طور پر شاعر کے کرافٹ سے متعلق ہے مگر مواد کی گہرائی اور عصری سچائی ہی کسی فن پارے کو امر کرتی ہے اور زمان و مکان کی قیود سے آزاد کر دیتی ہے خصوصاً ان معاشروں میں جہاں زمینی حقیقتیں غیر یقینی اور مبہم ہوں۔

اب ''ادب برائے ادب'' یا ''ادب برائے زندگی'' کی بحث بہت پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب کا رشتہ زندگی سے جڑے رہنے ہی سے ادب کو زندگی ملتی ہے یعنی life breeds life۔ شاعر کا ذریعۂ اظہار یا medium یقیناً اس کا کرافٹ یا تخلیقی جوہر ہے مگر جو مواد وہ نظم کر رہا ہے اگر وہ جیتی جاگتی زندگی سے متصل نہیں ہے تو اس کے کلام کی آفاقیت پہ حرف آئے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مواد کی اہمیت اس کی ماہیت میں مضمر ہوتی ہے، trivial موضوعات پر کہی ہوئی چیزیں عارضی ہی ہو جاتی ہے اصل مواد تو وہ ہوتا ہے جہاں سے زندگی اپنا تشخص وضع کرتی ہے وہ جدلیاتی عناصر جو مجموعی اور اجتماعی زندگی کی تنزلی یا ترقی کی رفتار اور سمت متعین کرتے ہیں اب وہ چاہے ارضی ہوں یا سماواتی ان پر واضح موقف اختیار کرنا فرض ہے کسی بھی ایسی کوشش کا جو فلاح اور ترقی کے لیے گامزن ہو ایسے کسی بھی موقف کا اظہار، فرض ہے ہر اس شاعر کا جو زندگی کی خمیدگی کو کم کرنا چاہتا ہو۔ جوش نے ہر نزاعی مسئلے پر ایک دوٹوک رائے رکھی اور ظاہر کی ہے پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتا ہے۔ نہ ان کا اسلوب Lack of clarity لیے ہوئے ہے نہ ہی ان کی فکر میں lack of character ہے۔ یہ defining moments ہی فکر کو اعتبار بخشتے ہیں اور دانش پہ سان

چڑھاتے ہیں۔

عموماً فکری شاعری یا ادب سے مراد ''مابعد الطبیعاتی'' امور سے متعلق کرنا تصور کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ما بعد الطبیعات کو مافوق الفطرت (super natural) چیزوں سے متعلق سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن پچھلی چند دہائیوں سے اس کی تعریف میں بہت واضح فرق آیا ہے۔ آج کی فکر کے تناظر میں اسے معقول سے محسوس بنانے کے عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر ''بنیادی قوانین'' اور ''منطقی اسباب و علل'' پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا جائے وہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ مابعد الطبیعات محض ''وجود'' کے بارے میں سوال کرنے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ تو اس راز کو پالنے کا نام ہے کہ ''وجود'' بھی متسوالیہ (questionable) ہے۔ یہ بحث شاید نسبتاً ترقی یافتہ اور زیادہ باشعور معاشروں میں اتنی ناگزیر نہ ہو جتنی ایک کم ترقی یافتہ یا اڈعایت پسند معاشرے میں کیونکہ یہاں آبادی کی تقسیم، امن و امان کی تفہیم اور انصاف کی ترویج سب کا دارومدار عقیدے پہ ہوتا ہے۔ یہاں اوتاری (Dogmatic) اور دیوتائی دقوتوں (Deity) کے خلاف جنگ کرنا ہی زندگی اور اس کی قدروں کو بحال کرنا ہے۔ یہاں ''اچھائی'' اور ''برائی'' کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی ''خانہ بندی''، انسانیت کو زخم زخم کرنے اور زندگی کو بے توقیر کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ شاید وہی ادب، وہی شاعری جو مروجہ ضرر رساں عوامل کی بیخ کنی کرے اور اصل Source کو ہدف بنانے سے نہ خوف کھائے، اجتماعی شعور کا معیار بلند کرے، فرسودہ منقولات سے گریز اور لوگوں کو ان کے جائز حق سے روشناس کرائے اور انہیں ان کے حق کے لیے اکسائے وہی فکری ادب ہوگا۔

اسلامی دنیا میں باضابطہ اور معروضی تعقل و تفکر کا رجحان بہت کم رہا ہے کیونکہ ہم ہمیشہ ادعایت کا شکار رہے ہیں۔ ہم تو سماجی علوم (social sciences) پر بھی آزادانہ انداز سے نہیں سوچتے دیگر امور تو دور کی بات ہے۔ اب ان حالات میں یہ ذمے داری بھی شاعروں کے حصے میں آئی۔ اب شاعر تو پھر شاعر ہوتا ہے اس سے کسی منضبط فلسفہ کی آس لگانا ایسے ہی ہے جیسے سورج سے اوس مانگنا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ وہ شاعر جو انحراف پسند یعنی Non-conformist ہو۔ کیونکہ اس سے جہتیں تو ملیں گی اور ابعاد تو سامنے آئیں گے مگر شاعرانہ روش اور قلندرانہ ترنگ شیرازہ بندی کی

متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہاں conformist (اقراری) فکر کے حامل شاعر کے یہاں یہ امکان ہو سکتا ہے کیونکہ وہاں نظریاتی یا مذہبی شیرازہ بندی موجود ہے صرف شعری ترغیب سے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔

شاعر کی فکر تو احساس کی زد پر چلتی ہے وہاں تو معقول کو محسوس بنانا ہی اصل فن ہے۔ ادھر محسوسات کی اپنی مجبوریاں (limitations) ہیں۔ حواس کے حوالے سے حقیقت کو آشکار یا قبول کرنا بیسویں صدی میں یوں بھی ایک اہم فلسفیانہ الجھاؤ بنا رہا ہے۔

جوش کی حد تک یہ بات بالکل درست ہے کہ تفکر ان کا مزاج اور تعقل ان کا احساس بن چکا تھا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی فکری بے ضابطگی ان کی غیر معروضیت کی دین تھی۔ نہ صرف یہ کہ ان وابستگی میں اضطراب تھا بلکہ ان کو تضادات کی زیریں لہر میں موجود ہم آہنگی کا عرفان حاصل ہو چکا تھا۔ اس ذہنی فضا میں انہیں ہر نئی چیز، ہر نیا پہلو اور ہر نئی فکر اپنی طرف کھینچتی تھی اور ان کی زیر نظر کی ہر شے کے متعلق رائے قائم کرتی اور ان کی بے باکی اور خوش ہمتی ان سے اس کا اظہار کرواتی تھی۔ اس سے ایک طرف یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کی فکر میں گہرائی کم تھی دوسری طرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ خود بھی گومگو میں تھے اصل میں ایسا ہے نہیں۔ فکری لحاظ سے کم از کم دو چار نکات تو ایسے ہیں جو اردو شاعری کی حد تک تو صرف جوش نے ہی برتے ہیں اور یہ ان کو جدید تر آفاقی فکر کا ہمنوا بنا دیتے ہیں ان مثالوں میں جانے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ جوش کے حوالے سے مسئلہ جبر و قدر کو بھی موضوع گفتگو بنایا جائے۔ یہاں جوش نے خوب خوب چہلیں بھی کی ہیں، معرکے بھی سر کیے ہیں اور ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ جبر و قدر کو ہم نے ہمیشہ عقیدے اور مذہب کے حوالے سے ہی دیکھا ہے لیکن جوش کے یہاں جو الجھاؤ ہے اس کا ناطہ شاید Meno paradox کی الجھن سے ملتا ہو جہاں اس حقیقت یا سچائی کی بات ہوتی ہے جو کسی عمل یا تجربے کی مرہون منت نہیں جس کو محض الہام یا استغراق سے حاصل کیا جا سکتا ہے جس کو priori Truths (صدق ماسبق) کہا گیا اسی کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے نابغۂ روزگار انگریزی مفکرین برٹینڈ رسل اور جی ای مور کی جدید تر ریسرچ جہاں وہ کسی حسّی تجربے کو اثر کے دو حصوں میں تقسیم کرا کے ایک کو شعور میں مادی پیکر بتاتے ہیں اور دوسرے طرف اس سے اخذ کردہ دانش کو غیر مرئی ادراک گردانتے ہیں جہاں حقیقت جاننے کے کم از کم دو

مظاہر ہیں ایک Objects of Acquaintance (جنس آ گہی) اور دوسرا object of description (جنس ابلاغی) ہیں۔ رسل کے نزدیک جنس آشنائی زیادہ قابل بھروسہ ہے بہ نسبت جنس ابلاغی کے۔ اب جوش کے یہاں جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ اس priori tuth یعنی ''دھیان'' میں آئی ہوئی حقیقت سے متعلق ہے جو کسی حد تک رسل کی جنس آشنائی کے متشابہ ہے۔ جوش کو یہ ''جی'' یا دھیان'' میں آنے میں ایک جبر کا عنصر نظر آتا ہے۔ وہ اکثر اپنی گفتگو اور تحریروں میں بھی اس مسئلے کو اٹھاتے نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ صرف جوش ہی کے لیے نہیں یہ مسائل کسی بھی free thinking دماغ کو سوال کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ جوش کو اس سوال کرنے پر سراہنے کے بجائے مطعون کیا گیا کیونکہ ہمارے بیشتر نقاد حضرات ''جبر'' محدود اور مذہبی مفہوم کی روشنی میں اس کا ادراک کرتے ہوئے جوش پر یہ اعتراض کرتے پائے گئے کہ اگر جوش جبر'' کے قائل ہیں تو ''انسان کی عظمت'' اور عروج کے اس حد تک خواہاں کیسے ہو سکتے ہیں کہ اس کو الوہیت کے منصب پر فائز دیکھنے کے خواہش مند بھی ہوں۔ اصل میں تو یہ فکر اردو میں آج بھی اجنبی ہی ہے۔ جوش کا اعزاز تو یہ ہے کہ انہوں نے ایک باقاعدہ فلسفی نہ ہوتے ہوئے بھی اس امر کا ادراک کیا۔ اس کے علاوہ بھی جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا گیا اور پہلے بھی مضامین میں ذکر کیا گیا کہ جوش کی فکری بوقلمونی میں اس کے علاوہ بھی بہت سے نمائندہ اور بالکل انوکھے رنگ میں ''جیسے'' انسان کا موت پر قابو پالینا اور اس سے منسلکہ خدا کا تصور''۔ ''مکر حواس کا ادراک''۔ انسان کا الوہیت کے درجے پر فائز ہونے کا امکان۔ آزادئ مطلق کا تصور:۔ ہمارے ناقدین نے کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ جوش کی فکری معجز نمائی کو بہت گھٹایا۔ ذرا یہ رباعیاں دیکھئے:

اک طرف کشاکش میں گھرا ہوں معبود
مکار حواس اور وہ بھی محدود
بالفرض اگر کشفِ غطا بھی ہو جائے
پھر بھی نہ یقیں آئے کہ تو ہے موجود

ہشیار آگہی کے طالب انسان
دریائے حواس مکر کا ہے طوفان
خلاقیِ وہم کے نہاں خانے کا
مالِ مسروقہ بیچتا ہے وجدان

آوازۂ حق نشتر فصاد نہیں
اک ذرہ بھی پروردۂ ارشاد نہیں
ممکن ہی نہیں عدم سے پیدا ہو وجود
عالم فقط اظہار ہے ایجاد نہیں

ہر لمحہ وبال بن گیا ہے اے جوش
ہر ذرہ سوال بن گیا ہے اے جوش
ہر چیز کی لِم کرید نے کا لپکا
جی کا جنجال بن گیا ہے اے جوش

ٹھہرے افواہ کیا دلیل مطبوع
کیا ہوا فقِ گماں سے ایقان طلوع
تفصیل سے قانون شہادت جو پڑھا
تو خیر سے ماں باپ بھی نکلے مسموع

معلول کو کب نظر میں تولا نہ گیا
قفل علّت کسی سے کھولا نہ گیا
'کس طرح' کے مسئلے میں کیا کیا چھکے
کیوں کہ جو چھڑی بات تو بولا نہ گیا

اس کے علاوہ مسئلہ جبر کو لے کر جوش نے جو طنزیہ شاعری کی ہے وہ دراصل اس مروجہ اور شخصی خدا کے حضور سپاسنامہ پیش کیا ہے جس کو یاران کبار جانے مانے بیٹھے تھے۔ ان کی اس قسم کی رباعیوں نے بھی ان کی اصل اور زیادہ سنجیدہ فکر کو سمجھنے میں دشواری پیدا کی ہے

ہر در ہے بحر در مشیت مسدود
بس میں نہ ہبوط ہے نہ قابو میں صعود
اس بندۂ مجبور و مقیّد کے گناہ
کس کی فرد عمل میں لکھوں معبود

دنیا کو بلاؤ ں سے اماں دو یار و
اوراد کو ہونٹوں پہ تکاں دو یارو
طوفان ٹل جائے گا دعائیں مانگو
آندھی تھم جائے گی اذاں دو یارو

اسی تفکر مزاجی کو اور آگے بڑھائیں تو بے شمار نثری اور شعری تخلیقات ایسی ملیں گی جہاں جوشؔ ایک با قاعدہ سماجی Visionary کے طور پر نظر آتے ہیں۔ رباعیوں، نظموں اور خصوصاً اشارات کے نثری مضامین لگ بھگ ستر برس پہلے لکھے ہوئے ہیں اور ان کے مواد کی تازگی اور Relevance اب تک اپنی طرحداری قائم کیے ہوئے ہے۔ کون سا ایسا پہلو ہے معاشرے کا جس

کے بارے میں جوش نے کھل کر نہیں لکھا ہے۔ اشارات ہی کو اگر لیجے تو ''بھارتیہ ساہتیہ پریشد، سیاسی انجمنیں، ہمارے شاعر، ہمارے پیر، ہمارے مجتہد، قومیت کا تخیل، عقل کی باتیں، ہندوستانی پردہ اور ہمہ دانی ایسے مضامین ہیں جو روزمرہ زندگی اور معاشرے کی کج ادائیوں کو نہ صرف معرض تحریر میں لاتے بلکہ ان پر دوٹوک رائے بھی دیتے ہیں۔ کچھ مضامین جو یقیناً کسی بہت زیادہ disturbing واقعے کے ردعمل میں لکھے گئے ہیں ان کا اسلوب یا اسٹائل بہت aggressive اور طنز آمیز ہے۔ ویسے یوں بھی جوش کے یہاں نفسیاتی Shock treatment کا استعمال بڑی چابکدستی اور فراخدلی سے جابجا مل جاتا ہے۔ اسی مجموعے میں بہت سے بلکہ بیشتر مضامین بہت ہی مدلل اور تیر بہ ہدف ہیں۔ اب دیکھیے پردے پہ جو مضمون ہے ''خیر وشر'' کے حوالے سے جو مختصر مقالہ ہے یا پھر ہمہ دانی کے عنوان سے جو علم معلوم وعلم محسوس گفتگو ہے اس میں حکیمانہ طرز استدلال اپنایا ہے گیا اور بہت ہی نپی تلی اور دل کو لگنے والی تاویلیں دی گئی ہیں یا ایک جگہ اور کسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندو مسلم تعصب کو روکنے کا بہترین ذریعہ inter-marriages ہیں۔ یہ نکتہ سماجیاتی sociology میں ایک مستقل فکر کی حیثیت رکھتا اور اس کا اطلاق کہیں بھی ہوتی نبرد آزمائیوں پر ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے سماجی حکماء ان امور پر بات کرتے ہوئے اب بھی لرزتے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں جو ہونا تھا وہی ہوا اور معاشرہ تنزلی اور انحطاط کا شکار ہوتے ہوتے محض نقالی کرنے کے قابل رہ گیا ہے۔ جوش نے تہذیبی اور تمدنی حوالے سے جو کچھ کہا اور لکھا ہے اس سے صرف نظر کرنا، چاہے وہ مذہبی عدم تحفظ کی وجہ سے ہو یا سیاسی شعبدہ گری کی وجہ سے ہمیں بہت مہنگا پڑا اور پڑتا رہے گا۔ ایک آزاد رائے ایک خود احتسابی کا دیانت دار عمل اور ایک بے باک ترجمان، ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر ''الفاظ وشاعر'' کا حوالہ نہیں دیا وہ ایک الگ علمی بحث اور معرکہ آرا مضمون ہے۔ اسی کتاب میں ایک مضمون اور نظر سے گذرا ''اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت'' جو انتہائی وقیع اور قابل قدر مضمون ہے۔ اتفاقاً ڈاکٹر قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ''جوش ملیح آبادی۔ خصوصی مطالعہ'' میں ایک مضمون کسی خاتون ڈاکٹر کا ''جوش اور رشید جہاں'' پڑھا۔ یہ مضمون بظاہر جوش کے مضمون کے جواب میں رشید جہاں صاحبہ کے غیر مطبوعہ آرٹیکل ''اردو ادب میں انقلاب کی ضرورت'' کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار نے یہ لکھا ہے کہ گویا

رشید جہاں نے جوش کے مضمون کے خلاف مضمون لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو۔ مجھے جزوی اختلافات تو نظر آتا ہے اس بات میں کہ جوش جس کو ''غیر اصل و مصنوعی'' شاعری کہہ رہے ہیں وہ بوجوہ رشید جہاں صاحبہ کو مصنوعی نہیں معلوم ہوتیں۔ ان کا نقطۂ نظر بہت حد تک واضح اور مدلل ہے۔ لیکن مضمون نگار کا دیا ہوا دوسرا اقتباس یہاں نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ (اس مضمون کو حال ہی میں پڑھا تھا اور حافظے میں تازہ تھا اس لیے یاد آ گیا اور کوئی خاص بات نہیں) اس اقتباس میں رشید جہاں صاحبہ جوش کے موقف کی حمایت بھی کرتی نظر آرہی ہیں اور جو مخصوص حوالہ اور جس رجحان کی نشاندہی انہوں نے کی ہے وہ اقبالؔ کے ترانے سے ہے۔ لیکن فاضل مصنفہ نے جس طرح اصل اعتراض سے صرف نظر کر کے اسے جوش سے منسوب کر دیا وہ ہمارے ناقدین کے اس عمومی رویے کی طرف واضح اشارہ ہے جو جوش کی بابت روا رکھا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کا منشا بھی یہی ہو ممکن ہے سہو ہو گیا ہو یا misprint ہو۔

''اگر شد روز را گوید شب درست میں'' کی غلامانہ تعلیم، غلامی کی حالت میں رہ کر ایک غیر حکومت کے زیر نگراں بسر کر کے ہم کیا لکھ سکتے ہیں؟ کیا آزادی کے شیخی باز ترانے گائیں؟ جس طرح رات کو دن کہنا غلط اور بزدلی ہے اسی طرح اپنے کو غلام نہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ بعض شاعر تو زمانۂ حال کے بموجب بے چارگی اور لاچاری جس کا اثر ان کے دماغ پر بھی ہے، جذبہ پیش کرتے ہیں۔ اور بعض ''چین و عرب ہمارا'' کا غلط جوش عوام میں پھیلا دیتے ہیں۔ اور کہاں تک ان کا بے ڈھنگا جوش صحیح ہے اور غلامانہ کیفیت سے دور ہے اس کا اندازہ ہر کوئی لگا سکتا ہے۔ ہمارا ادب ہماری موجودہ سوسائٹی کا عکس ہے۔ اور کوئی نیا انقلاب جو ادب میں صرف اصلیت کو جوش سے ظاہر کرتا ہے، سچا ادب نہیں۔''

جوش کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو ان کا تصور حسن ہے۔ جوش کی سرشاریت اور محویت صرف حسن تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ ان کی حظ اٹھانے کی صلاحیت میں منتقل ہو کر ایک طلسماتی کیف transform کرتی ہے جو بسا اوقات بہت خوشگوار حد تک متعدی (contagious) ہوتا ہے۔ ان کا تصور حسن Kant aestheticism کی ''عدم دل چسپی اور جسمانیت لمسیت سے عاری سرشاریت'' اور Freud کی ''جبلی خواہشات اور نفسانی ترنگ کی ارتقائی شکل کے بین

بین رہنا ہے۔ جوش کے یہاں حسن صرف صوری نہیں ہے وہ خیالی، وجدانی اور جدلیاتی بھی ہے۔ ان کی نظموں میں، رباعیوں میں ایسی مثالیں بے شمار ملیں گی مگر جہاں بات حسن فطرت کی یا حسن زن کی آتی ہے وہاں جوش کی شدت عجب عجب کرشمے دکھاتی ہے۔ ان کے ذہن میں جو لامحدودیت اور آفاقیت تھی اس نے حسن فطرت کو بھی روایتی مظاہر سے متجاوز کیا اور حسن زن کو بھی۔ ان کے مظاہر حسن میں جہاں برسات، ندی، پہاڑ، دریا، سمندر، موسیقی، سحر، گھٹا، فاختہ کی آواز ہے وہیں خالی بوتل، بہار کی ایک دوپہر، کسان، ہل، بجھا ہوا دل اور رقیق لے بھی ہے وہیں جب جوش نے حسن زن پر نگاہ ڈالی تو ان کو روایتی حسن اور معاشرتی حد بندیاں نہیں روک سکیں۔ ان کے یہاں تو حسن اپنی پوری سج دھج کے ساتھ آتا ہے اور ہر روپ میں آتا ہے اس کی کوئی سماجی برادری نہیں ہے۔ جوش نے یقینی اور الوہی انداز میں حسن کو Magnanimity اور profoundity دی اس سب کے باوجود عورت کی طرف جوش کا رویہ انتہائی قدامت پسندانہ، مربیانہ، سرمایہ دارانہ اور ملسیت زدہ ہی رہا۔ وہ اس حوالے سے اپنے ماحول اور اپنی نسل سے بغاوت نہیں کر سکے۔ عورت ان کے سامان تعیش کی سب سے حسین و نازک ترین شے تھی اور رہی۔ ان کے مزاج میں بلا کا تلذز تھا اور وہ ساری عمر اس سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے بلکہ اس خامی کو محسوس بھی نہ کر سکے عورت ان کے نزدیک commodity ہی رہی مگر ان سب کے باوجود ان کی فکری دیانت ایک دفعہ پھر کرشمہ سازی کر گئی۔ جوش کے ہم عصروں، ان کے پیش روؤں، حتیٰ کہ ان کے بعد آنے والے شاعروں اور ادیبوں میں بھی یہ اخلاقی استقامت نہیں نظر آتی کہ وہ اپنی شاعری ''میں'' اور ''زندگی'' میں عورت کی طرف جو رویے ہیں ان میں مماثلت (consistency) رکھیں۔ یہ لوگ اپنی شاعری میں عورت کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ اس عورت کی نہیں ہے جو ان کی زندگی میں یا ان کی سیج پر ہے جبکہ جوش کی زندگی اور شاعری کی عورت کا تشخص ایمانداری پر مبنی ہے، ریاکاری پر نہیں اس لحاظ سے بھی جوش کا جو کنٹریبوشن ہے اس پر مثبت انداز سے بالکل نہیں لکھا گیا۔ دوسری طرف جوش کو تلف کر دینے سے، ان سے صرف نظر کرنے سے، عورت اردو شاعری میں دوبارہ اسی منافقت کا شکار ہو گئی جس کا ان سے پہلے تھی یا جس کا شکار وہ معاشرے کے دیگر اکائیوں میں ہے۔ اس طرف باقاعدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادیبوں اور شاعروں کی منافقت کا پردہ چاک ہو سکے۔

جہاں تک focus شفٹ کرنے کی بات ہے تو جوش کی اس قبیل کی کچھ نظمیں تو اسقدر مشہور ہیں کہ صرف ان کا نام لے دینے سے اہل ادب اور سنجیدہ شاعری پڑھنے والوں کو متعدد اشعار اور پوری پوری نظمیں یاد آ جائیں گی۔ جنگل کی شہزادی، مالن، کوہستان دکن کی عورتیں، جامن والیاں، فتنۂ خانقاہ، سہاگن بیوہ، جھریاں، الھڑ، ماما اور محبت اور نگاران مردہ اور ایسی ہی بے شمار عہد ساز نظموں کو کون بھول سکتا ہے۔

جہاں جوش نے بہت سے paradigm بدلے وہیں حسن کا منبع source بھی بدلا۔ اور شاعری کی نگاہ پہلے جہاں نہیں پڑتی تھی اب پڑنے لگی اسی کے ساتھ حسن کا معیار بھی پہلے پہل جوش کی نظموں کی بدولت تبدیل ہوا۔ اب حسن ''سیاہ فام'' بھی ہونے لگا اور بدن اور اعضا کی نازکی ہی لائق تعریف نہ رہی بلکہ حسن کی Stereo typing میں کمی آنا شروع ہوگئی۔ جوش عورت کو تلذذ آمیز اور عاشقانہ نگاہوں سے ہی دیکھا کیے مگر ان کی وسیع النظری پھر بھی کارفرما رہی۔ ان کی نظم ''کوہستان دکن کی عورت'' کا ایک ہی مصرعہ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

''ہجر اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں''

اور اس کے بعد ''حسن اور مزدوری ہے جوش عورت کو برابری تو نہیں دیتے مگر مربیانہ انداز میں اس کے آلام کا حل ڈھونڈتے ہیں اور ایک بار پھر غلامی سے نجات میں ہی ان کو اس مسئلے کا حل بھی نظر آنے لگتا ہے۔

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
جوش ان ہاتھوں میں کنگن جگمگانا چاہیے

اس علاوہ ان کی دو بہت ہی اچھی نظمیں اس حوالے سے خاتون مشرق اور خاتون مغرب ہیں۔ کچھ رباعیات نجوم و جواہر میں بھی ہیں جہاں وہ عورت کو پالنے کی دوڑی کا امین اور نظام ہستی کا معین بتاتے ہیں مگر صحیح معنوں میں ان کا رویہ عورت سے سرتا سر ایک عاشق کا رہا مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اس معاملے میں کبھی civility اور احترام کا دامن نہیں چھوڑا۔ دہلی کے نیا ادب کے دفتر میں سپاہی خاتون کی تصویر کا تذکرہ ''جوش اور عورت'' کے باب میں متعدد بار ہوا مگر وہ ایک شوخ اضطراری اور جزوی رخ ہے کلی رویہ نہیں۔ کچھ بھی ہو جوش نے اردو شاعری میں عورت کی

دہری شخصیت کو اپنی بے ریا طبیعت سے بدلا ضرور۔

اب آتے ہیں جوش کے اسلوب کی طرف جو کہ انتہائی متحرک، توانا اور طلسماتی ہونے کے ساتھ ساتھ ست رنگا بھی ہے۔ ست رنگا اس لیے نہیں کہ وہ ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے شیدائی تھے۔ (یہ تو الگ بحث ہے جس کا تعلق (semantics) معنویات، (Phonetics) صوتیات سے ہے اور اس پر گفتگو شاید آگے چل کر ہو بھی) بلکہ اس لیے کہ ان کے یہاں موضوعاتی اکائی کا ایک خاص التزام ہونے کی وجہ سے ہر نظم اور ہر شعر اپنے پیکر کے ساتھ وارد ہوتا تھا۔ ان کی متخیلہ میں ایک ایسی نادر ہم آہنگی (unison) تھی کہ خیال خود لفظ کی شکل میں اس پر آشکار ہوتا تھا۔ جوش نے کئی جگہ کہا ہے کہ ان کو خیال کے لیے الفاظ تلاش نہیں کرنے پڑتے بلکہ ان کے یہاں خیال خود لفظوں کے روپ میں آتا ہے۔ یعنی خیال کا وارد ہونا اور اس کے بعد اس کا شعری روپ میں ڈھلنا جوش کے یہاں دو الگ الگ تخلیقی عمل نہیں ہیں۔ بے شمار شعری تخلیقات اتنے مختلف النوع طرز بیان کی حامل ہیں کہ اگر ان کا نام نہ درج ہو اور صرف زبان کی ساخت، لفظوں کی آویزش اور لسانی آمیزش سے اندازہ لگانا ہو تو کوئی بھی نہ جان سکے کہ یہ ایک اتھاہ سمندر کی مختلف موجیں ہیں۔ سیف و سبو، سنبل و سلاسل، نقش و نگار، سموم و صبا، شعلہ و شبنم حتیٰ کہ الہام و افکار، نجوم و جواہر اور محراب و مضراب میں بھی بے شمار ایسے شاہکار ملیں گے جن کا تعلق لسانی اور اسلوبی اعتبار سے بالکل جداگانہ ہے۔ جوش کو محض ادق اور ثقیل زبان کا الزام دینے والے اگر خود بھی کچھ مطالعے کی مشقت کریں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ جوش کے یہاں یہ بات شروع سے آخر تک کے کلام میں عیاں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ''واردات'' یا ''نفس مضمون'' خود طے کرتا ہے کہ اسے اپنا اظہار کس ڈکشن میں مقصود ہے ان کی قوت متخیلہ اور linguistic faculties اتنی فعال اور ہمہ گیر (profound) ہیں کہ فکر یا جذبے کو من و عن اعلیٰ شعری پیکر میں ڈھلنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ جوش کے حوالے سے فراق نے کسی جگہ کہا تھا کہ کیونکہ زندگی خود Perfect نہیں ہے اس لیے زندگی کی کوئی بھی manifestation چاہے وہ ادب ہی کیوں نہ ہو اسے Perfect نہیں ہونا چاہیے (حافظے کی بنیاد پر نقل کر رہا ہوں اور اپنے لفظوں میں، ہو سکتا ہے کوئی چوک ہو جائے)۔ یہ ایک بڑا دل چسپ آبزرویشن ہے خصوصاً ایک ایسے شخص کی زبان سے جس نے اپنی کتاب کا انتساب ہی

شاعرِاعظم جوش کے نام کیا ہو۔لیکن شاید بڑی دیانتدارانہ بھی ہے۔دیکھیے جس طرح غالبؔ کو اپنے بیاں کے لیے اسلوب میں گھٹن کا احساس ہوا تھا شاید اسی طرح جوش کو بھی اپنی تخلیقی فعالیت، وجدانی حسیت اور غیر معمولی قدرت بیان کے باعث مضامین و مضمرات میں کمی اور یکسانیت کا احساس ہوا ہو اور اس لیے وہ ہر آن نئی فکر، نئے نکات اور نئے مسائل کی تلاش میں اپنے رنگارنگ مشاہدے سے اس کمی کو، کم از کم اپنے لیے (compensate) پورا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔اس کو نفسیاتی طور پر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۵ کے بعد سے جوش نے اپنے آپ کو جیتی جاگتی زندگی سے کاٹ کر اور اس ازلی روح رواں sense of belonging سے محروم کر کے شاید اپنے تخلیقی مسائل میں اضافہ کر لیا ہو۔شاید اسی لیے انہوں نے اپنے آپ کو "نقیب شاعر فردا" کہا ہو۔بہرحال کسی طور سے بھی دیکھیں ایک بات تو تقریباً واضح ہے کہ اردو میں صرف دو ہی شاعر ایسے ہیں جن کی تخلیقی سرّیت کا دارومدار "معنیٰ" پر ہے "لفظ" پر نہیں مگر اب اس کو کس طرح بیان کیا جائے کہ یہی دو شاعر اردو کے معدودے چند شعرا میں بھی ہیں جنہوں نے بے شمار تشبیہات وضع کیں، ہزاروں لفظی پیکر تراشے ایک ایسا استعاراتی نظام تخلیق کیا جس نے نہ صرف شعری امکانات کو لامحدود کیا بلکہ آج تک ایمائی اور علامتی شاعری ان کے جہان معنیٰ میں سانس لے رہی ہے۔

اس مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ جوش کے اسلوب پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں اور کمزوریاں تلاش کی گئی ہیں ان کی ماہیت اور کمیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ان کے مضمرات کو سمجھنے اور محرکات کو جانچنے کی کوشش کی جائے۔

جوش پر جہاں بہت سے اعتراض ہوئے وہیں یہ بھی کہا گیا بلکہ باربار کہا گیا کہ جوش کی نظموں میں کثرت الفاظ اور تواتر بہت ہے۔نظموں میں بالیدگی کا فقدان ہے۔پھر یہ بھی اکثر کہا گیا کہ جدید نظم کی میکانکی ساخت کے لحاظ سے جوش کی نظمیں بوجھل اور منطقی انجام سے عاری ہیں۔ان اعتراضات میں سے کچھ تو یقیناً بہت valid ہیں اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ پچھلے پچاس سالوں میں ہماری ادبی اور شعری اساس خصوصاً نظم کے حوالے سے بہت بدلی ہے اور اب ہم کلیتاً انگریزی جدید نظم کی ساخت پر لکھنا چاہتے ہیں۔اس میں صرف دو قباحتیں ہیں ایک تو یہ کہ انگریزی ادب نے اپنے کلاسیکی ادب سے صریحاً انحراف نہیں کیا دوسرے یہ کہ ہماری psyche ابھی تک نہیں بدلی تو

اب بیشتر ایسی نظمیں اسلوب کے اعتبار سے ایک نیم اثر جذبات سے عاری میکانکی ڈھانچہ بن جاتی ہیں۔اس کا سب سے بڑا ثبوت شاید یہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی قابل ذکر اور شدید ردِّ عمل ہوتے ہیں، چاہے وہ مثبت ہوں یا منفی، اسی شاعری کو پڑھ کر یا سن کر ہوتے ہیں۔اب چاہے وہ اقبال کی دیوتائی پذیرائی ہو یا جوش سے معاندانہ بے اعتنائی ۔ فارم سے قطع نظر وہ مواد content کو respond کرتے ہیں ۔ جو بہت مقبول نظمیں ہوئی ہیں اس عرصے میں بھی وہ اکثر و بیشتر نظموں سے زیادہ ''آزادغزلوں'' کے زمرے میں آسکتی ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ غزل سے ہمارا عشق قائم و دائم ہے۔یقیناً جوش کی جو بھی کمزور نظمیں ہیں وہ اس عیب کا شکار ہیں اور جو ان کی اعلیٰ نظمیں ہیں وہ اسی وصف سے عبارت ہیں ۔ گویا ہمارا مسئلہ مواد اور فارم کے یکجان و دو قالب ہونے یا نہ ہونے سے ہے۔اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنی موسیقی کی مثال سامنے رکھیں تو شاید بات کچھ اور واضح ہو سکے۔ ہمارے سرگم لینا تان لگانا ، پلٹے لینا، بہلاوے، راگ اور ٹھاٹ میں جگہیں بنانا، خیال کی گائیکی اور ٹھمری اگر صرف اس لیے خارج کر دی جائیں گی کہ زیادہ تر لوگ ان سے محظوظ نہیں ہوتے یا سمجھ نہیں پاتے یا اس میں طوالت بہت ہے تو پھر یہ تو آرٹ اور کرافٹ کی روح کے منافی بات ہوگی ۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں اور ان کی تعداد اس وقت شاید نوے فیصد سے تجاوز کر چکی ہو کہ آرٹ ، شعر و ادب سب بیکار ہیں تو کیا اب ان کی بات مان لی جائے اور جو بھی خیال وارد ہوا سے دو سطر میں خبر کی طرح بیان کر دیا جائے اور بس۔

دراصل ہر چیز کا اپنا مقام ہے جیون ساگر میں سب کے لئے جگہ ہے۔جس طرح پوپ میوزک کا اپنا مقام ہے اور اصل میوزک کا اپنا۔اسی طرح پوپ شاعری کا اپنا مقام ہے اور اصل شاعری کا اپنا۔کہا جاتا ہے کہ آرٹ اور فنون لطیفہ انسان کے تحت الشعور پر اثر انداز ہوتے ان کا اپنا subliminal دائرۂ اثر ہے۔ ہاں بیشتر اردو کی نظمیں اور بے شمار معرکہ آرا نظمیں اردو میں ایسی ہیں جن کے مختلف حصے منہا کر دیے جائیں تو شاید ان کے مواد پر کوئی اثر نہ پڑے مگر کیا ان کی اثر پذیری میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔اس عمل تدوین سے بیشتر نظمیں مختصر اور کچھ شاید مواد کی اعتبار سے جامع بھی ہو جائیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ، مشاہدے کے تجزیاتی مظاہر کا سحر، تخلیقی اکائیوں کے impulse شعری تلازمے میں موسیقیت کے کیف resonance سے تحت الشعور کو متاثر

کرنے کے ہنر اور اس سے بڑھ کر جہان معنی کے مختلف جہات اور ابعاد کو لفظوں کے finer shades سے آشکار کرنے کے لطیف عمل کا کیا نعم البدل ہوگا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ لی جائے کہ آج کا شاعر بھی اسی پیرائے میں نظم کہنے کی کوشش کرنے لگے۔ نہیں ایسا کرنا شاید نہ ممکن ہے نہ سودمند۔ کیونکہ ہماری زندگیوں سے ریاضت کا عنصر بالکل اٹھ گیا ہے نہ تخلیق کار میں ہے نہ قاری میں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسے مغربی ادب نے اپنے ہر دور کے ادب کو اس دور کے تناظر میں دیکھا ہے وہ تہذیب نظر ہمیں بھی اپنانی ہوگی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ملٹن کو شروع میں رد کیا مگر اپنے زیادہ بردبار، سنجیدہ اور مبعوث دور میں اسی ملٹن کو قبول بھی کیا۔ کیونکہ ایلیٹ نے نہ حصول علم سے منہ موڑا نہ ریاضت فن سے، تو لامحالہ نتیجہ وہی ہوسکتا تھا جو ہوا۔ جوش کو من وعن قبول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جوش کے یہاں خامیاں ہوں گی اور ہیں مگر اسی یارڈ اسٹک (yardstick) سے اوروں کو بھی ناپیے۔ پیمانے معروضی ہونے چاہیئں شخصی نہیں۔ اپنی ہم سہل پسندی اور تعصب کی وجہ سے تخلیقی تاریخیت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

جوش اردو ادب کے اسلوبیاتی نظام کے بہت برگزیدہ ہستیوں میں آتے ہیں ان کا معنوی نظام اتنا مربوط ہے کہ غالب کے بعد اس باب میں انہی کا نام آئے گا۔ جوش کی اساس ہی معنی ہے۔ جس انگریزی یا مغربی نظم سے ہم اتنے متاثر ہیں اگر اس کے صوتیاتی اور معنویاتی نظام پر جوش کے اسلوب کو پرکھیں تو کھرا سونا ملے گا۔ جن لوگوں نے ڈھونڈا ہے انہوں نے پایا ہے۔

اب آخر میں جوش کے کلام سے کچھ مثالیں اس وضاحت کے ساتھ کہ میرے نزدیک اسلوب صرف تشبیہوں، استعاروں، امیجری اور میکانکی ساخت سے عبارت ہیں نہ ہی صرف معنویاتی ارتباط اور صوتیاتی نظام کا نام ہے۔ اسلوب تو ان تمام چیزوں کا مرکب ہونے کے ساتھ ساتھ زمینی حقیقت اور ایک ماورائی فطانت کی آمیزش سے حاصل کردہ ترسیلی اکائی کا نام ہے۔ خون میں چٹکیاں لینے اور لاشعور کے کسی نہاں خانے میں اک دائمی ارتعاش پیدا کردینے کا ہنر ہے۔ جوش نے الفاظ تو الفاظ بحروں سے حیرت انگیز کام لیا ہے۔ اُن کی ۱۹۴۰ کے آس پاس کی مشہور نظم ہے "تعاقب"

مرد ہو عشق سے جہاد کرو
تم مجھے بھول کر نہ یاد کرو

اس نظم میں جوش نے بحر کے استعمال اور الفاظ کے Rythmic pattern سے وہ کام لیا ہے کہ ہر لفظ تعاقب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی بات کو برسوں پہلے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون ''جوش اعظم'' میں لکھا بھی تھا۔

اسی طرح جوش کا ایک اور غیر مطبوعہ شعر۔

گاہ دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے
چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

یا ایک بہت پرانی غزل کا ایک شعر۔

گذر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا

اس ''چراغ مجلس روحانیاں کی لطیف ترایمائیت خاصے کی چیز ہے۔

یا پھر وہ ذہن ساز اور عہد آفریں فکر کا حامل شعر۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اسی قبیل کے دو چار اشعار اور یاد آرہے ہیں۔ اسلوب کی اثر آفرینی دیکھتے جایئے:

دشمن کی سمت ایک ذرا مسکرا کے دیکھ
اس حربۂ لطیف کو بھی آزما کے دیکھ

======

بدلے کی رسم دین وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

======

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے

آیئے ہم ساتھ مل کر جوش کے چند مصرعے جو اس وقت یاد آرہے ہیں ان کے تخلیقی اعجاز سے لطف

اندوز ہوتے ہیں

مہک رہی ہے ہوا کم سنی کی خوشبو سے
برہنہ پا ہے تو ہر نقشِ پا گلابی ہے
بھنورے ہیں کہ اڑتی ہے کہانی پہ کہانی

شعری بوطیقا میں غیر معمولی حسیت کے ساتھ ساتھ خلاقانہ ایمائیت کے امتزاج سے جو بوقلمونی پیدا ہوتی ہے اس کی سحر انگیزی کو پیمبرانہ اثر آفرینی کے علاوہ اور کیا نام دیا جائے۔ چند رباعیاں یا اشعار اسی تناظر میں ملاحظہ فرمائیے۔

انسان کی توحید کا مشتاق ہوں میں
شمع حُبِّ عمیم کا طاق ہوں میں
مشرق کا نہ پابند، نہ مغرب کا اسیر
انسان ہوں باشندۂ آفاق ہوں میں

======

کیا بتاؤں کہ وہ دم گلگشت
کس ادا سے قدم اٹھاتی ہے
جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

آخر میں آج کی دنیا کے تناظر میں جوش کی یہ ایک دردمندانہ پکار۔

ایمان کی لذات کی خواہش ہے شدید
ہر چیز ہے اسباب طرب کی تمہید
حوران بہشت و دختران کفار
باقی نہ اگر رہیں تو غازی نہ شہید

======

اک چاپ ہے تاریک گذر گاہ میں ہشیار

اک سایہ ہے دیوار پہ ہاں جاگتے رہنا
تم اونگھ بھی جاؤ گے تو دامان تمدن
پھٹ جائیگا مانند کتاں جاگتے رہنا
سن سن ہے خموشی میں دن بول رہا ہے
فتنے ہیں دبے پاؤں رواں جاگتے رہنا

☆☆☆

جوش فہمی کی طرف ایک قدم

عتیق اللہ

جوش ہی نہیں جوش کے علاوہ بھی ایسے بہت سے نام ہیں جنھیں بالخصوص ان کے عہد میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ بہت بعد میں جا کر ان کے غیر معمولی تخلیقی جوہر کا اعتراف کیا گیا۔ ہمارے تشہیری اور صارفی دور میں ردّ و قبولیت کے جو معیار فروغ پا رہے ہیں اور حقیقی اہلیتوں کو جس طور پر جھٹلانے اور نظر انداز کرنے کی روش کے گُر آزمائے جا رہے ہیں ان کے جبر سے جوش کل بھی آزاد نہیں ہو پائے تھے اور المیہ یہ کہ آج بھی ہماری تنقید کے باب ان پر تقریباً بند ہیں۔ میری نظر میں غالباً اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔

ا۔ اقبال کی غیر معمولی مقبولیت اور ان کی تخلیقی استعداد جو ان کے ہم عصر ہی نہیں ان کے بعد کی نسلوں میں بھی کئی قسم کی نفسیاتی گرہیں پیدا کر چکی تھی جو ایک فطری امر تھا۔

۲۔ جوش ہمارے آخری کلاسیکی شاعر تھے۔ ایک نسل ایسی پیدا ہو چکی تھی جو جتنی تجربہ پسند تھی اتنی ہی روایت شکن بھی تھی۔ حتیٰ کہ ترقی پسند شاعری کی بہتر مثالیں جس قسم کے ارتکاز اور صلابت اور چیزوں کو سمجھنے کی نئی فہم کی مظہر تھیں نئی اور پرانی نسل کے درمیان جو خلیج واقع ہو گئی تھی اس کے کم ہونے کا امکان کم سے کم تھا۔ نئی میزانِ قدر نے پرانی قدر کی جگہ لے لی تھی۔ نئی تنقید نے تو ان سے اغماض برتا ہی حیرت ان نقادوں پر ہے جو مشرقی شعریات کا دم بھرتے تھے لیکن جوش کو انھوں نے بھی توجہ کے لائق خیال نہیں کیا۔

ادبی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر نسل اپنے پیش رو کے اثرات کی تشویش یا تناؤ میں مبتلا رہتی

ہے۔ ہیرالڈ بلوم نے اس کیفیت کو فرائڈ کے اڈی پس کامپلیکس کے تصور کی روشنی میں The anxiety of influence سے تعبیر کیا تھا۔ جیوئن اور مقتدر تخلیقی فن کاروں کے حق میں وہ پیش رونسل جو مستحکم اور توانا ہے، ہمیشہ خوف، تذبذب، کشمکش اور کشیدگی کا سبب بنی رہتی ہے۔ ادبی تاریخ اور اس کی روایت کا یہ جبر ہوتا ہے کہ ہر نسل اپنے ماضی کی کوکھ ہی سے پیدا ہوتی ہے اور پھر ماضی کو اپنے ذہنوں سے کاٹ کر ایک نئے ماضی کو خلق کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے وہ گذشتگان کو رڈ بھی کرتی ہے، اس سے خوف بھی کھاتی ہے اور اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے بھی دیکھتی ہے۔ رڈ و قبول میں Binary opposition کا رشتہ بھی ہے۔ رد کرنے میں کہیں نہ کہیں قبولیت کی ایک ننھی منی سی خواہش بھی تہ نشین ہوتی ہے۔ کیوں کی جسے رد کیا جاتا ہے، رد کرنے سے پہلے اسے پوری طرح اپنی فہم کا حصہ بنایا جاتا ہے اور فہم کا حصہ بنانے کے دوران اس کے بہت سے اجزا لاشعوری طور پر ذہن کے کونے کدروں میں دب چھپ جاتے ہیں بعد از اں بغیر کسی ارادے کے وہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے جیسے احتجاج کی روش اقبال اور جوش دونوں کے یہاں ہے۔ دونوں ہی نو آبادیاتی محکومی اور نو آباد کاروں کی تہذیبی یلغار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جوش کے احتجاج میں تحفظ شکنی، زور آوری اور مزاحمت کا پہلو زیادہ حاوی ہے جوان کے عہد کا تقاضہ بھی تھا، اقبال اپنے جذباتی وفور پر قدغن لگاتے ہوئے چلتے ہیں اور احتجاج احتجاج سے زیادہ شکوہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جوش ایک ہی نظم میں بہت سی نظموں کا مواد بھر دیتے ہیں اور اقبال بہت کچھ دوسری نظم یا نظموں کے لئے بھی بچا رکھتے ہیں۔ قومی بے حسی اور مجہولیت پر دونوں وار کرتے ہیں لیکن جوش کا وار زیادہ شدید ہوتا ہے کیوں کہ ان کے طنزیہ لَے میں طعن و تشنیع کے رنگ کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ جوش جب بھی اپنی قوم کی نا عاقبت اندیشیوں، منافقتوں اور بے کرداری کو موضوع بناتے ہیں ان کی کشیدہ خاطری اور آزردگی یک لخت برافروختگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر میں انھیں اردو کا پہلا angry young man کہتا ہوں۔ اس معنی میں وہ بڑھاپے میں بھی جوانوں کا کردار ادا کرتے ہیں اکثر غم وغصہ کی افزونیت سے نظم کا تانہ بانہ جگہ جگہ سے کھل ضرور جاتا ہے لیکن یہ چیز اثر آفرینی میں کہیں مانع نہیں آتی۔ اردو کی شعری روایت سے مانوس قاری نظم کے اس کردار سے بخوبی واقف ہے۔ ایک رنگ کے مضمون کو جب سو رنگ میں باندھا جاتا ہے تو نظم کے

اندر محسوسات کے قماش از دہام کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور یہ نمو پذیری ہماری شعری روایت سے کوئی علاحدہ اور اجنبی چیز نہیں ہے۔

جوش کا بنیادی اخلاقی فریضہ الم گریزی اور حصول لذت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے sufferings کا راستہ قومی زوال کے احساس سے ہوکر جاتا تھا جو جتنا اجتماعی تھا اتنا ہی انفرادی بھی تھا۔ عقلی کم جذباتی زیادہ تھا، عقیدے کی آمیزش نے ان چیزوں کی قبولیت کی راہ کو نسبتاً آسان بنا دیا تھا۔ جوش کا مسئلہ ایک ایسی اقلیم دریافت کرنے سے تعلق رکھتا تھا جس کے فرماں رواصرف اور صرف جوش ہوں۔ اس فرماں روائی کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے از روئے ترجیح ایک ایسے نشاطیہ آہنگ پر بنیاد رکھی جو بلند تھا، اقبال سے زیادہ بلند بلکہ شور آگیں اور سماعت آزما بھی۔ انھوں نے اقرار کے بجائے جرات انکار کو زیادہ التفات کے لائق سمجھا۔ روایتی اخلاقیات اور دینِ بزرگاں کو سوال زد کرنے کے خطرات مول لئے۔ صاف گوئی اور بے باکی کی ایک ایسی مثال قائم کی جو ہماری شعری روایت میں قطعاً ایک نیا اقدام تھا۔

اردو کی وہ شعری روایت جس کی نشو ونما کلاسیکی نظام بلاغت کے تحت ہوئی تھی اور جو بالخصوص تہذیب لفظ کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے۔ اس کا اپنا ایک وقار اپنی ایک شان تھی۔ جوش بلا شبہ ہماری کلاسیکی شعری روایت کی سب سے آخری کڑی ہیں۔ لسانی سطح پر جوش نے اپنے امتیازات کی ایک جداگانہ کائنات تشکیل کی ہے وہ ایک ایسے دور میں بدیعیاتی سطح پر زیادہ سے زیادہ امکانات کو بروئے کار لائے جب کلاسیکی مشرقی شعری اقدار کی طرف عدم توجہی عام ہو چلی تھی۔ جوش نے کہیں ایسا کوئی لفظ یا لفظی ترکیب استعمال نہیں کی جو صوتیاتی سطح پر سامعہ نواز نہ ہو۔ آوازوں کے جن مرکبات اور لفظی دروبست کا انھیں ادراک تھا اور اس ادائیگی میں جو والہانہ پن تھا وہ معمولی لسانی شعور کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا پورا ایک ذہنی اور تہذیبی تناظر تھا۔ اسمائے صوت کو وضع کرنے اور انھیں مختلف ترکیبوں میں ڈھالنے کی سب سے پہلی مثال زٹلی نے قائم کی تھی لیکن زٹلی لفظ یا کسی شئے یا عمل سے پیدا شدہ یا وابستہ آوازوں کی نقل میں الفاظ بنانے کے سلسلے میں ارادۃً نفاست دشمن واقع ہوئے تھے۔ ایک محدود سطح پر نظیرؔ نے بھی لفظ کاری اور صوت کاری میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ جوش نے خطیبانہ آہنگ کو زیادہ سے زیادہ اثر کار بنانے کے لئے آوازوں کی نفیس تنظیم اور ترکیبوں کی جس

خلاقانہ شعور کے ساتھ تشکیل کی ہے اس کی نقالی بھی تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔

ایک مثال ان کے اس آخری مرثیے سے اخذ کی گئی ہے جس میں پانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پانی کے ہزار رنگ دکھانے کے بعد اس کی آوازوں کو وہ اس طور پر کسب کرتے ہیں:

ٹپ ٹپ شرر شرار تڑا تڑ چھنن چھنن
دھماں دھوم دھام، دھمادھم دھنن دھنن
گم گاؤ روم جھوم ،جھماجھم جھنن جھنن
گھن گھن گرج گھماؤ گھماگم گھنن گھنن

گرجے جو ابر میں تو فلک چہچہا اٹھے
انگڑائی لے تو سر پہ دھنک چہچہا اٹھے

مجاز کے نام جو پند نامہ لکھا تھا، اس میں بھی نشہ انگیزی اور سرمستی کی کیفیات کو نو بہ نو لفظوں اور آوازوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو میں لفظ تراشی یا نو الفاظ سازی (Neologism) کی ایسی مثال غالباً نایاب ہے۔

لات، گھونسا، چھڑی، چھری، چاقو
لب لباہٹ ،لعاب، کف، بدبو

لڑکھڑاہٹ، بلوتے، بڑ، ہذیان
بے کلی، نیند، بے خودی، نسیان

طنز، آوازہ، برہمی، افساد
طعن، تشنیع، مضحکہ، ایراد

شور، ہو، حق، ابے تبے، ہے ہے
اوکھیاں، گالیاں، دھماکے، قے

مَس مساہٹ، غشی، تپش، چکر
سوز، سیلاب، سنسنی، صرصر

استحالہ، اہانت، استحقار
احتراق، احتباس، استکبار

چل پخے، چخ، چناں، چنیں، چنگھاڑ
چخ پخے، چاؤں چاؤں، چیل .چلھاڑ

معرکہ، مفسدہ، محاذ، مصاف
گونج، گالم گلوچ، گرز، گزاف

دُر دُبک، دور، دھر پٹخ، دوں دوں
غل غپاڑہ، غنن غنن، غوں غوں

لپا ڈگی، لتاڑ، لام، لڑائی
ہول، ہیجان، ہانک، ہاتھا پائی

اوبھ، اندوہ، آہ، اف، آزار
اونگھ، آشفتگی، عرق، ادبار

کھل بلی، کاؤں کاؤں، کھٹ منڈل
ہونک، ہنگامہ، ہم ہمہ، ہل چل

پینترے، پیچ، پشتکیں، پھنکار
ڈغ ڈغے، ڈھائیں ڈھائیں، ڈینگ ڈکار

اُلجھن، آوارگی، اُدھم، اینٹھن
بھونک، بھوں بھوں، بھنن بھنن بھن بھن

ڈھول دھپا، دھڑ پکڑ، دھتکار
تہلکہ، تو تڑاق، تف، تکرار

بو، بھبک، بھے بکس، برر، بھونچال
دبدبے، دندناہٹیں، دھمال

بلبلاہٹ، بخار، بھناٹا
غلغلہ، غل، غریو، غناٹا

تشنگی و تکان و تندی و تاب
گردش و گرد، گرمی و گرداب

جوش ان الفاظ کو نئی زندگی بخش دیتے ہیں جو نامانوس ہیں یا جنھیں عرف عام میں متروک کہا جاتا ہے۔ یا عمل اور اشیا سے پیدا شدہ اصوات جن میں درشتی اور کرختگی کے باوجود نفاست کا بھی ایک کردار ہوتا ہے جوش کو بے حد للچاتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ زندگی کے احساسات کو تازہ دم رکھتے ہیں۔

لفظوں کے نئے نئے جھرمٹ خلق کرنے نئے نئے لفظ گڑھنے، نئی نئی اور قدرے نامانوس ترکیبیں وضع کرنے اور رعایتوں کی کہکشائیں ترتیب دینے میں جوش کو کمال حاصل تھا۔ جو گہرے لسانی شعور ہی کی مظہر نہیں ہیں بلکہ تخلیقیت سے معمور بھی ہیں۔ جا بجا ضدوں کے جوڑے مرتب کرنے میں جوش ایک بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کے دوسرے متعلقات بے جوڑ نہ معلوم ہوں، جیسے:

علم کو تلخی و ترشی، جہل کو قند و نبات
خوب کو زہر ہلاہل، زیست کو آب حیات
نار کو روشن سویرا، نور کو تاریک رات
واہ کیا تیور ہیں اے انصافِ میر کائنات

مرحبا صد مرحباؤ آفریں صد آفریں
شکر اے جاں آفریں آفریں صد آفریں

اس بند میں علم اور جہل، خوب اور زشت، نار اور نور جوڑے دار ضدیں ہیں۔ جوش نے ہر ضد کے متعلقات کی رعایت کو برقرار رکھتے ہوئے معنی کے جو قماش مرتب کیے ہیں ان کے اپنے جواز ہیں۔

اس قسم کی مثالیں اور بیان و بدیع کے نت نئے پیرائے جوش کی شاعری میں جہاں تہاں بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں پیرایوں کے پیچھے جوش کا ایسا نظام فکر بھی کارفرماں ہے جس میں انتشار کی کیفیت ہے۔ یعنی خیال کے ارتقا کی کوئی ایک رو تہ بہ تہ جاری و ساری نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے اپنی کلیت میں ہر نظم کا ایک معنیاتی نظام ہوتا ہے جس میں ایک خودروی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ تاہم ہر معنی ایک وسیع الذیل معنی کے تابع ہوتا ہے، جو نظم کو اپنے محور سے اکھڑنے نہیں دیتا۔ جوش کے مراثی اور رباعیوں پر تو یہ بات صادق آتی ہے۔ ان کی نظمیں بھی اپنے کل سے زیادہ اپنے جزوں میں معنی کے دفتر کے دفتر کھول دیتی ہیں۔ طنز و ہجا اور طعن و تعریض سے متعلق جتنے دقیق اور نفیس طریقے ہو سکتے ہیں انھیں آزمانے میں سودا کا نام یقیناً بہت بلند ہے۔ لیکن امکانات کے طور پر جو کچھ کہ ان چھوا رہ گیا تھا جوش کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ بہت سی مثالوں میں سے صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں جسے میں نے نظم رشوت سے اخذ کیا ہے:

اس گرانی میں بھلا کیا غنچۂ ایماں کھلے
جو کے دانے سخت ہیں، تانبے کے سکے پل پلے
جائیں کپڑے کے لئے تو دام سن کر دل ہلے
جب گریباں تا بہ دامن آئے تو کپڑا ملے
جان بھی دے دے تو سستے دام مل سکتا نہیں
آدمیت کا کفن ہے دوستو کپڑا نہیں

صرف اک پتلون سلوانا قیامت ہو گیا
وہ سلائی لی میاں درزی نے ننگا کر دیا
آپ کو معلوم بھی ہے چل رہی ہے کیا ہوا
صرف اک ٹائی کی قیمت گھونٹ دیتی ہے گلا
ہلکی ٹوپی سر پہ رکھتے ہیں تو چکراتا ہے سر
اور جوتے کی طرف بڑھئے تو جھک جاتا ہے سر

تھی بزرگوں کی جو بنیائن وہ بنیا لے گیا
گھر میں جو گاڑھی کمائی تھی وہ گاڑھا لے گیا
جسم کی اک ایک بوٹی گوشت والا لے گیا
تن میں باقی تھی جو چربی گھی کا پیپا لے گیا
آئی تب رشوت کی چڑیا پنکھ اپنے کھول کر
ورنہ مر جاتے میاں کتے کی بولی بول کر

جوش کے مطالعے کے بے شمار عنوانات ہیں۔ میرا موقف بس یہ ہے کہ جوش کی اپنی تشکیل کردہ کائنات ہے، جس پر صرف اور صرف ان کا اجارہ ہونے کے باوصف انیس، نظیر اور اقبال کے متون کی گونج سے وہ خالی نہیں ہے اور جوش ہی نہیں کسی بھی شاعر کا متن دوسرے بہت سے متون کا زائدہ ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں اثر وقبولیت کے معنی تبدیلِ محل یا Transposition کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایسی تقلیب پذیری Transmutation کا عمل ہے جسے تغیر نوع یا تبدیلی جوہر کا نام دینا درست ہوگا۔

☆☆☆

یادوں کی برات: ایک تہذیبی بازیافت

ابوالکلام قاسمی

جوش ملیح آبادی نے اپنے بعض مجموعوں میں اپنے تخلیقی عمل اور نظریہ شاعری کے بارے میں جو مضامین لکھے تھے ان سے جوش کی نثر نگاری اور اسلوبیاتی انفرادیت کا نقش کم و بیش اس طرح قائم ہوا تھا جس طرح ان کی شاعری سے زبان و بیان پر ان کی قدرت اور بلند آہنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مگر اپنی شاعری سے متعلق ان کے مضامین تخلیقی اسلوب کو کم اور ترسیلی انداز اور اسلوب کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ البتہ 'نقوش' کے شخصیات نمبر میں فانی بدایونی پر ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں جوش کی تخلیقی نثر کے عمدہ نمونے شامل ہیں۔ یادوں کی برات، نہ تو عام معنوں میں شخصی اور سوانحی کتاب ہے اور نہ صرف ایک شاعر کے تخلیقی محرکات کا بیان۔ خودنوشت سوانح کی صنف چونکہ تاریخ، سوانح اور ناول جیسے اسالیب اظہار سے خاصی قریب ہوتی ہے اس لئے اس صنف میں لکھنے والا، سوانح نگاری کی واقعیت سے قدرے آزاد ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اپنے آپ کو ایک تاریخ نگار کے طور پر بھی نہیں پیش کرتا اس لئے، تاریخیت کے جبر سے بھی اپنے آپ کو مشروط رکھنے پر مجبور نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنی تحریر کو ناول کا نام نہ دینے کے باعث پلاٹ اور کردار نگاری کے تقاضوں سے اس طرح عہدہ برہونا اس کے لئے لازمی نہیں ہوتا جس طرح ایک ناول نگار کے لئے بعض ضابطوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ خودنوشت سوانح کی صنف جہاں ایک طرف ان متذکرہ اصناف نثر کی پابندیوں سے بلند ہوتی ہے ویں پر آپ بیتی لکھنے والا ان تمام اصناف کے

ہے مثبت پہلوؤں کو رو بہ عمل بھی لا سکتا ہے اور اپنی خود نوشت کو اپنی ذات، اپنے معاشرے اپنی تاریخ اور اپنے معاصر کرداروں کا نگار خانہ بھی بنا سکتا ہے۔ یادوں کی برات لکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے کسی مخصوص نوعیت کی صنفی ذمہ داری قبول نہ کرنے کے باوجود ان تمام سرچشموں سے فیض حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا ثبوت فراہم کیا ہے جن سرچشموں نے خود ان کی شخصیت اور ان کے زمانے کی تعمیر میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

یادوں کی برات کا مطالعہ تنوع اور مختلف قسم کے تاثرات یا ردعمل پیدا کر سکتا ہے۔ ایک تاثر یہ ہو سکتا ہے کہ یادوں کی برات، میں واقعہ نگاری کے نام پر غلط بیانی، کو روا رکھا گیا ہے اور بہت سے شخصی اور تاریخی واقعات کو بھی غیر حقیقی اور غیر تاریخی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا تاثر مصنف کی خود پسندی اور نرگسیت کا ہو سکتا ہے، تیسرا تاثر خلاقی اور مذہبی مسلمات پر کاری خرب لگانے کا ہو سکتا ہے۔ ان تاثرات کے علاوہ ایک عام تاثر جوش کی خالص ذہنی اور تخیلاتی دنیا کی تصویر کشی اور اس تصویر کشی کے لئے ایک غیر معمولی اسلوب کی تخلیق کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب کے بارے میں یہ تمام تاثرات پوری صداقت نہ ہونے کے باوجود جزوی صداقت کے طور پر اس طرح کے کسی بھی زاویۂ نگاہ کی تصدیق اور توثیق کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ آپ بیتی کی صنف کو اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر اپنانے کے باعث جوش اس طرح کا کوئی بھی تاثر قائم کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ یادوں کی برات میں زبان اپنے آپ کو ایک الگ معروض کی حیثیت سے قائم کرنے میں کامیاب ہے، اور اس کتاب کا بیانیہ، خارجی واقعات کی صداقت، واقعیت یا تاریخیت سے ماورا ہو کر ایک ایسی یادوں کا معاشرہ ہونے کے باوجود قاری کے جانے پہچانے معاشرے سے کسی قدر ملتا جلتا مگر بڑی حد تک مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس بیانیہ سے اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ زبان کی تشکیل جس حقیقت کی تخلیق کرتی ہے وہ واقعاتی پیش کش ہونے کے باوجود ایک طرح کی غیر مانوس مانوسیت کے تاثر سے بھی دوچار کرتی ہے۔

جہاں تک 'یادوں کی برات' میں بیان ہونے والے واقعات کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں مصنف نے کتاب کی تمہید میں ہی اپنے حافظے کے ضعف کا اعتراف کر لیا ہے، اور یہ ضعفِ حافظہ

کچھ اس نوعیت کا ہے جسے نہ تو قرین قیاس کہا جا سکتا ہے اور نہ قابل وثوق۔ جوش لکھتے ہیں کہ:۔

''میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے پہلے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لئے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا ....اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، اور اگر دو چار سکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص نہ یاد آجاتا تو یقین فرمایئے کہ میرا دم نکل جاتا.................. میں نے یہ بات اس لیے لکھ دی کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی، یا تقدم و تاخر نظر آئے، تو آپ اسے میرا اراوی فعل نہ سمجھیں، اور میری حالت پر ترس کھا کر، اسے معاف کر دیں۔''

۱۳

اس اقتباس کے آخری فقرے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوش نے حافظے کے ضعف کی تمہید ہی اپنی غلط بیانی کے جواز اور حفظ ماتقدم کے طور پر باندھی ہے۔ یادوں کی برات، میں ابتدائی باتوں کے عنوان سے اس نوع کی اور بھی جو پیش بندیاں کی گئی ہیر وہ دراصل افسانہ طراز ذھن کے کھل کھیلنے اور نری واقعیت یا تاریخیت سے اجتناب برتنے کی خاطر ہیں۔

یادوں کی برات، کے ابتدائی صفحات میں ایک عنوان 'خود کشائی' کا قائم کیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت جوش صاحب نے اپنی زندگی کے بنیادی میلانات، شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی، بتائے ہیں۔ شعر گوئی، کے علاوہ دوسرے میلانات کی توثیق ان کی زندگی کے حقیقی واقعات سے کس حد تک ہوتی ہے؟ یہ تو ان سے قریبی واقفیت رکھنے والا شخص ہی بتا سکتا تھا، البتہ جوش صاحب نے اپنی کتاب میں اپنے بیانات سے ایک ایسا خاکہ مرتب کیا ہے جو ان کے بیان کردہ شخصی میلانات کی منصوبہ بند تصدیق کرتا ہے، اور اس منصوبہ بندی سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی معمولی حافظے کا مالک اتنی طویل خودنوشت کا خاکہ اس جامعیت کے ساتھ مرتب نہیں کر سکتا کہ اپنے

تسا صحیح خیالی دنیا کی تعمیر، حتیٰ کہ غلط بیانیوں کا جواز کتاب کے ابتدائی حصے میں پہلے سے موجود ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش صاحب اوّل و آخر ایک شاعر تھے اور شاعری میں ان کے امتیازات نے ان کو اس بات کا حق دے رکھا تھا کہ وہ اپنی خودنوشت میں جا و بے جا اور موقع بے موقع اپنی شاعری اور شعری نقطۂ نظر کا جواز فراہم کرتے اور اپنی شاعری پر وارد ہونیوالے اعتراضات کی مدافعت کی کوشش کرتے۔ اس معاملے میں انہوں نے نہ صرف احتیاط اور توازن کا ثبوت دیا ہے بلکہ شاعری کے سلسلے میں بعض مقامات پر ایسا حقیقت پسندانہ انداز اختیار کیا ہے جو اپنی شاعری پر ان کے اعتماد کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے اور یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ وہ مروجہ تنقیدی رایوں کو کس حد تک نا قابل اعتنا تصور کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کو بے ساختہ اظہار بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> ''شاعری میری حاکم ہے میں محکوم۔ وہ جابر ہے میں مجبور، وہ قاہر ہے میں مقہور، وہ آمر ہے اور میں مامور.........شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک خاص دینی مصلحت کی بنا پر یہ عجیب کلیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا اطلاق ہوگا جو بالقصد کہا گیا ہو۔ اگر یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے، تو چونکہ میں نے آج کی تاریخ تک ایک مصرع بھی بالقصد موزوں کے کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس لئے آپ کو اختیار کامل ہے کہ میرے تمام کلام کو شاعری سے کلیتہً خارج فرما کر میرے غیر شاعر ہونے کا اعلان فرمادیں۔ میں خوش، میرا خدا خوش۔''

جوش ملیح آبادی نے اپنے شعری انتخابات میں شاعری کے بارے میں اپنے نظریے کا جس طرح اظہار اور اپنے نقطہ نظر پر جتنا اصرار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ اپنی خودنوشت لکھتے ہوئے جب وہ تقریباً نصف صدی تک شاعری کر چکے تھے، تعلّی اور تفاخر کا بلند بانگ دعوی کرتے۔ مگر وہ جس توازن اور انکسار کا رویہ اختیار کرتے ہیں وہ 'یادوں کی برات' کے پورے مزاج سے مختلف اور خود جوش صاحب کی افتادِ طبع کے برخلاف معلوم ہوتا ہے۔

> ''جھوٹ کیوں بولوں، میرے گوش مبارک میں بھی شاعری یہ افسوں پھونک چلی ہے کہ حضور اقدس و اعلیٰ، اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی

اشعر الشعراء ہیں لیکن قوت وحیات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے .... بیشک یہ ہو سکتا ہے کہ آپ شاعر یا بہت بڑے شاعر ہوں۔ لیکن اسی طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ معمولی شاعر، برے شاعر یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں اس لئے دانائی یہی ہے کہ ابھی آپ اپنے باب میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں..........''

اس حزم واحتیاط اور توازن کو کم از کم اپنی شاعری کے سلسلے میں انہوں نے پوری کتاب میں برقرار رکھا ہے۔ اور مشکل ہی سے دو ایک جگہ کے علاوہ کہیں اور اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرانے کی کوشش کی ہے جوش ملیح آبادی جیسے ممتاز شاعر کے لئے اپنی خودنوشت لکھتے ہوئے اس باب میں ضبط نفس کا ایسا ثبوت، ایک غیر معمولی بات ضرور معلوم ہوتی ہے۔

یادوں کی برات، واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ مصنف کی ذاتی زندگی، ذہنی اور تخلیقی محرکات، خاندان، ملازمت، نقل مکانی اور معاشقوں سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ چند قابل ذکر احباب اور اپنے دور کی چند عجیب ہستیوں کے خاکوں پر مبنی۔ ان خاکوں میں ہماری ملاقات بعض ایسی نامور ہستیوں سے بھی ہوتی ہے جن کو ہم ان کے کارناموں کے باعث جانتے ہیں مگر بیش تر خاکے ان لوگوں کے ہیں جو نہ تو کوئی سماجی علمی یا فنی امتیاز کے باعث جانے جائے ہیں اور نہ ان کو پہلے سے کوئی شہرت حاصل ہے۔ یہ سارے لوگ ایک طرح سے گمنام لوگ ہیں جو جوش صاحب کے قلم سے زندہ جاوید ہوتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک آپ بیتی کی صنف کے اطلاق کا سوال ہے تو بنیادی طور پر وہ پہلا حصہ ہی 'یادوں کی برات' کے صنفی دائرہ کار کا حصہ ہے۔ اس حصے میں ذاتی احساسات یا واردات کا بیان ہو یا اپنے معاصر معاشرے کی پیش کش جوش صاحب نے واقعات کی خارجی سطح سے کہیں زیادہ ان واقعات کے بارے میں اپنے ذاتی اور داخلی ردعمل سے سروکار رکھا ہے اس اعتبار سے جوش صاحب کے ذاتی یا تجرباتی معاملات ایک قسم کے ناسٹیلجا کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور ناسٹیلجا کے روپ میں جہاں ایک طرف بیانیہ کی غر معمولی قوت بن کر نمودار ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف یادوں کے حوالے سے ان کی قلب ماہیت بھی ہو جاتی ہے۔ اس قلب ماہیت کا سب سے بڑا نمونہ اس کتاب کا وہ باب ہے جو مصنف کے معاشقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں تو یادوں کی

اس برات میں اشخاص اور واقعات بھی شامل ہیں مگر اشخاص اور واقعات کے حوالے سے جو چیز یادوں اس برات کے جاہ وجلال اور تزک و احتشام کا تاثر قائم کرتی ہے وہ ان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی وہ تہذیبی بازیافت ہے جو اشیاء اور واقعات کو قوت اور توانائی فراہم کرتی ہے۔ اس طرح آپ بیتی کا حصہ بھی دو اجزاء میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک کا تعلق جوش صاحب کی زندگی کی سرگزشت اور واقعات کی خارجی منطق سے ہے اور دوسرے کا تعلق ثقافتی اور تہذیبی حوالوں سے۔ جہاں تک جوش کی سرگزشت اور واقعات کی خارجی شکل وصورت کا سوال ہے تو اس ضمن میں وہ ہماری ملاقات اپنے عزیز و اقارب، احباب، ادبی اور سماجی رشتوں اور ان متعدد شخصیتوں سے کراتے ہیں جنہوں نے انہیں کسی نہ کسی اعتبار سے متاثر کیا۔ ان تفصیلات کے بیان میں یادوں کی برات میں واضح طور پر دو طرح کے اسالیب اختیار کئے گئے ہیں۔ جہاں کہیں مصنف محض اپنے بیانیے سے کام لیتا ہے وہا ں واقعات کی منطقی ترتیب بروئے کار لائی گئی ہے اور جہاں اس کا مقصود واقعات یا تجربات کی خارجی سطح کے ساتھ داخلی سطح کو بھی نمایاں کرنا ہوتا ہے وہاں واضح طور پر استعاراتی اور تخلیقی زبان کا سہارا لیا گیا ہے۔

جوش صاحب نے ایک جگہ اپنے والد کی وفات اور اس کے کچھ عرصے کے بعد اپنی شادی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> ''میرا سا بد بخت و بد نصیب دولہا کون ہوگا۔ شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا جب کہ میرے باپ کا کفن ابھی میلا بھی نہیں ہوا تھا اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں۔ میرے پھاٹک کی شہنائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے ۔میری ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے میرے دل کا جون ابل رہا تھا۔ تاشوں کی جھنکار کف افسوس مل رہی تھی۔ اور مجھ نامراد کی شادی کے دوش پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔''

اس اقتباس کے تمام فقروں میں شعری اور تخلیقی وسائل اختیار کئے گئے ہیں۔ ہر فقرہ مرکب تشبیہ کی ایسی اکائی ہے جس میں تضاد کی صنعت کے پس منظر میں تشبیہی یا استعاراتی پیکر ابھارا

گیا ہے۔ شادی کے جوڑے کے ساتھ کفن، سہرا کے ساتھ آنسوؤں کی لڑیاں، شہ نائیوں کی آواز کے ساتھ نوحہ، مہندی کے ساتھ دل کا خون، تاشوں کی جھنکار کے ساتھ کف افسوس اور شادی کے دوش کے ساتھ جنازہ جیسی پیکر تراشی جوش کے تخلیقی اسلوب کی ادنی سی جھلک ہے۔ اس اسلوب کی معراج اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب وہ فضا آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ گاؤں کا منظر ہو یا کسی ریت رواج کا ذکر، کسی شخصیت کی ہشت پہل تصویر دکھانی ہو یا خود اپنے حسن و شباب کا تذکرہ، جب وہ اپنے موضوع کے گرد فضا سازی کا حالہ تیار کرنا چاہتے ہیں تو کم و بیش اس میں عمدہ شاعری جیسا ارتفاع پیدا کر دیتے ہیں۔ جوشؔ صاحب کی شاعری میں الفاظ کی کثرت اور شعری منظر نامے کو مترادفات کی تکرار کے ذریعے ایک نقطے پر مرتکز کر دینے کا جو الزام ان پر اکثر ہماری تنقید نے عائد کیا ہے، اس طرح کے انجماد سے ان کی تخلیقی نثر آزاد دکھائی دیتی ہے۔ شاید اس باعث رشید حسن خاں نے ان کے انشائیہ اسلوب کا موازنہ ان کے شعری اسلوب کے ساتھ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> ''یہ دلچسپ بات ہے کہ الفاظ کی کثرت اور تشبیہوں، استعاروں کی فراوانی نے ان کی شاعری کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس معنی میں کہ معنی کی توسیع کے بجائے تکرار کو اصل چیز بنا دیا ہے لیکن انہی اجزاء نے، یادوں کی برات کی نثر کو بے مثال دل کشی عطا کی ہے۔ یہاں ہم معنی یا قریب المفہوم لفظوں کی تکرار اور تشبیہوں، استعاروں کی کثرت مرقع نگاری کے انداز کو روشنی بخشتی ہے، اور جس چیز، منظر یا واقعے کا بیان ہے اس کو جگمگا دیتی ہے۔''

(تفہیم ۹۴ے)

یہ بات درست ہے کہ 'یادوں کی برات' میں جس جوشؔ سے ہماری ملاقات ہوتی ہے وہ ''غیر معمولی طور پر خود پرستی اور نرگسیت کا اسیر ہے، اور جہاں کہیں اپنے بچپن، اپنی جوانی یا اپنی شکل و صورت کے ذکر کا انہیں موقع مل جاتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک آئینہ خانے میں بنتا اور سنورتا دیکھنے کی کوشش میں اس طرح مصروف ہو جاتے ہیں کہ آرائش جمال سے فارغ ہونا ان کے لئے مشکل امر بن جاتا ہے یہی سبب ہے کہ اپنے خاندان، اپنے معاصرین اور اپنے معاشقوں تک میں ان کا ذاتی

حوالہ کبھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ حافظے کے ضعف کی پیش بندی اور حسن و عشق کی داستانوں میں یہی بنیادی محرک کارفرما نظر آتا ہے۔ محبت کے معاملے میں بھی ان کی توجہ اپنے آپ کو عاشق ثابت کرنے پر کم اور معشوق بنا کر پیش کرنے کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ جوشؔ صاحب نے اپنے جبلی محرکات میں انسان دوستی کا ذکر کثرت سے اس خاطر کیا ہے تا کہ وہ اپنی نرم دلی، رقت اور وسیع القلبی کا نغمہ گا سکیں۔ اس طرح کے کسی بھی منظر نامے میں ان کی ذات کے ساتھ ان کے گرد و پیش کی ثقافت اور تمدنی اقدار بھی پس منظر کا رول ادا کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کتاب ایک انانیت پسند، خود پرست اور نرگسیت میں مبتلا انسان کی آپ بیتی بن کر رہ جاتی۔ جن نقادوں نے جوشؔ صاحب کی یادوں کے حوالے سے ان کی افسانہ طرازی اور خیالی دنیا کی تعمیر پر اعتراضات کئے ہیں پر انہیں شاید اس حقیقت کا احساس نہیں کہ اس کتاب میں جوشؔ کی خود مرکزیت بھی تہذیبی اور ثقافتی حوالوں کے باعث ایک بڑا اور وسیع سیاق و سباق اختیار کر لیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض ایک فرد کے طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ ان کی پیش کش کے انداز اور ہمہ گیر تمدنی تناظر نے فرد کو ایک دبستان کی حیثیت بخش دی ہے۔

اگر آپ یادوں کی برات کا مطالعہ فرد واحد کے حوالے سے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی بازیافت کے طور پر کریں تو ان کی غلط بیانیاں بھی اپنا جواز پیدا کر لیتی ہیں۔ اکثر ناقدین جوش نے ان کے معاشقوں، ان کے آباء و اجداد کے ذکر، حتی کہ رسول کریمؐ کو خواب میں دیکھنے اور بشارت دینے کی صداقت پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رویہ بھی ایک قسم کا ثقافتی رویہ ہے جس کے باعث انسان اپنی ضرورت، تلاش معاش اور در بدری کو بھی شریفانہ حیلوں اور تاویلوں کے پردے میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جوشؔ صاحب نظام حیدر آباد سے اپنی ضرورت کا اظہار کرتے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک ایسے خواب اور ایسی بشارت کا سہارا لیا جو اپنے آپ ان کے لئے وسیلۂ ملازمت بن گئی۔ اب یہ بات بہت با معنی نہیں رہ جاتی کہ حیدر آباد جانے سے قبل جوشؔ صاحب نے والیِ ریاست کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا اور اس طرح دربار میں باریابی کا ماحول تیار کیا تھا البتہ اس نوع کے واقعات جوشؔ صاحب کی اخلاقیات پر ایک طرح کا سوالیہ نشان ضرور قائم کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ 'یادوں کی

برات' کے پورے خاکے میں ایسا کوئی منظر نہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک صادق القول اور اعلیٰ اخلاقی مدارج پر فائز انسان بنا کر پیش کرنا چاہتے ہوں۔ یہ آپ بیتی کی صنف کا تقاضہ اور آپ بیتی لکھنے والے شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ آپ بیتی کو اپنے نقائص کی پردہ پوشی کا کاغذی پیرہن بنانے کے بجائے جہاں تک ممکن ہو اپنے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں نہ صرف یہ کہ جوش صاحب کامیاب نظر آتے ہیں بلکہ وہ بعض سماجی مسلمات سے نجات حاصل کرنے کو خاصی جرأت اور جسارت کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی بے راہ روی کو اپنا بنیادی حق سمجھتے ہیں اور مذہبی اور سماجی قدغنوں کو ایک طرح کی رومانی اور باغیانہ نظریہ سازی کے ذریعے رد کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں البتہ اپنے آپ کو ہمدردی اور انسانی دوستی کی خاطر جوابدہ ضرور محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو ان کی زندگی کے اہم واقعات میں غربت و افلاس اور پس ماندہ عوام کے لئے کسی بڑے واقعے کا ذکر نہیں ملتا مگر نظریاتی سطح پر ہی سہی ان کی شاعری اور نثر میں اس کا حسی اور جذباتی اظہار ضرور ملتا ہے۔ وہ ایک مقام پر اپنی رقیق القلبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب کسی مفلس کے گھر کے چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی، میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی یتیم کی پسلیاں نظر آتی ہیں میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں۔ جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے، میری کم بخت آنکھیں آنسوں برسانے لگتی ہیں، اور جب کسی کے گھر سے جنازہ نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے''۔

ان جملوں میں زبان و بیان کا حسن اپنی جگہ مگر یہاں بھی مرکزیت اس شخص کو حاصل ہے جو ایسا کچھ محسوس کرتا ہے۔ یہاں بھی ذاتی حوالہ اور نجی احساس اور جذبہ بنیادی نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور پڑھنے والے کو مصنف کا گرد و پیش خود مصنف کی رگ و پے میں مرکوز نظر آنے لگتا ہے۔

'یادوں کی برات' میں خود مصنف اور مصنف کے وسیلے سے اس کا خاندان، اس کے معاصرین اور مجموعی طور پر اس کی نشو و نما میں شامل تہذیبی اور تمدنی صورت حال کیوں کر یادوں کے محور پر گردش کرتی نظر آتی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بیانیہ میں ذات

اور غیر ذات کا فرق مٹ گیا ہے۔ مصنف اپنے آپ کو ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے اور جا گیر دارانہ تمدن اپنے پورے تزک و احتشام کے ساتھ مصنف کی ذات میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وارث علوی نے اپنے ایک مضمون میں 'آخر شب کے ہم سفر' پر اظہار خیال کرتے ہوئے جب یادوں کی برات کو شب گزیدہ بستی اور آخر شب کے ہم سفر، جیسے ناولوں کی صف میں رکھا تھا تو بعض ادبی حلقوں میں اس نقطۂ نظر پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا گیا تھا مگر صنفی حد بندیوں سے ماورا ہو کر اگر تہذیبی سیاق و سباق کے اعتبار سے یادوں کے بیانیہ کا موازنہ ان متذکرہ ناولوں سے کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ 'یادوں کی برات' میں ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے جاہ و جلال کی جیسی غیر معمولی باز آفرینی ہمیں ملتی ہے اس کا جواب شاذ و نادر ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جا گیرداری یا زمین داری اشتراکی فلسفے کی آمد اور لبرل طرز فکر کے فروغ کے ساتھ ساتھ جس حد تک بھی معتوب اور مذموم ہو کر رہ گئی ہو مگر اس جا گیر دارانہ نظام نے جس تمدن اور ثقافت کو پالا پوسا تھا وہ تمدن بہر حال برصغیر کے لئے ایک ایسا سرمایۂ افتخار ہے جس کے باعث زندگی کے تمام شعبوں میں شائستگی، نفاست، احساس جمال اور فنون لطیفہ کا ایک دریا سا موجزن رہا ہے۔ اس ثقافت اور تمدن کا خاتمہ ان تمام اقدار کے خاتمے کے مترادف ثابت ہوا، جو اس تمدن سے وابستہ تھیں۔ اس لیے مٹتی ہوئی تہذیب و تمدّن کا کوئی بھی نوحہ محض تاریخ کی باز گوئی نہیں بلکہ تہذیب کی بازیافت بن جاتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے آپ کو صرف نوحہ خوانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ تہذیبی آثار کو اپنے حساس اور موثر قلم سے جیتی جاگتی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ انہوں نے یادوں کی برات میں ایک عنوان ''میرے عنوان شباب تک کا ہندوستان'' قائم کیا ہے۔ اس باب میں جوشؔ نے ہندوستان کی اپنی مشرقی اقدار اور مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تحت ایک قسم کی تہذیبی کشمکش کی صورت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس صورت حال میں جوشؔ خود کو مشرقی تہذیب کے دلدادہ کے طور پر ہی پیش نہیں کرتے بلکہ اپنی پرانی قدروں کے لئے ان کا احساس افتخار بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ یادوں کی برات، میں ہولی، دیوالی ،شب برات، رمضان، عید، بقرعید، اور محرم جیسے تہذیبی مظاہر کا بڑا ابھر پور ذکر ملتا ہے ان کے ذکر میں مذہبی عناصر کو پس منظر میں رکھ کر ثقافتی سطح پر ان موقعوں پر اپنائی جانے والی روایات اور رسوم و رواج یا ان سے متعلق سماجی مفہ وضات کی تفصلات تہذیبی مرقعوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جوش صاحب

امام حسین کی شخصیت کو بھی ایک تہذیبی قدر کے نمائندے کے طور پر پیش کرتے ہیں:

''وہ حسینؑ جس کے نظام انفاس کی اطمنان آمیز ہمواری کی زد پر میدان کربلا کی بادِ سموم کا دم ٹوٹ گیا تھا۔ جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آب آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں ...... لیکن میری زبان سے ان اعیانِ ممکنات کی تعریف سن کر اس مغالطے میں نہ پڑ جایئے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر ان کا مدح سرا ہوں ۔ میرے ان کے مابین جو رابطہ ہے وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے ....''

'یادوں کی برات میں ذکر خواہ ملیح آباد کا ہو، لکھنؤ کا، آگرہ اور علی گڑھ کا یا پھر حیدر آباد، کا ہر مقام پر جوشؔ صاحب کو تہذیبی حوالے ہی واقعات کے انتخاب یا عدم انتخاب میں مدد فراہم کرتے ہیں ۔ اس کتاب میں ایسا حیرت انگیز تنوع ہے کہ تہذیبی مرقعوں کے ساتھ شخصی خاکوں، خاندان کے لوگوں تیج تیوہاروں، ادبی منافشوں حتیٰ کہ معاشقوں اور لطیفوں کے بھی متعدد نمونے مل جاتے ہیں، مگر جوشؔ صاحب کی بنیادی دلچسپی کی نوعیت کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بنیادی سروکار تہذیبی اور ثقافتی ہے ۔ اس لئے جہاں کہیں وہ اپنے اس مرکزی حوالے سے دور گئے ہیں وہیں افراط و تفریط کے شکار ہوئے ہیں ۔ تقسیم ہند کے سلسلے میں انہوں نے ایک طرف تو تقسیم کے عمل پر اظہار خیال کیا ہے اور دوسری طرف اپنی ہجرت اور پھر پاکستان سے واپسی اور پھر دوبارہ نقل مکانی کا تفصیلی ذکر کیا ہے ۔ اس طویل بیان میں ان کی سادگی، سادہ لوحی کی حدوں کو چھو لیتی ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ سیاسی رشہ دروانیوں کے اسرار و رموز ان کی دسترس سے یکسر باہر ہے ۔ وہ جہاں جواہر لال نہرو سے اپنے قریبی تعلقات اور بعض دوسرے ہندوستانی اور پاکستانی زعماء سے بے تکلفی کا ذکر کرتے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فن کارانہ سادگی ہر تبسم اور تکلم کو محبت اور قربت کا نام دے دیتی ہے ۔ اس کے برخلاف سماجی اور انسانی سطح پر جب وہ اپنے خاکوں میں معروف اور غیر معروف لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہیں تو گویا ان کو آر پار دکھانے پر قادر نظر آتے ہیں ۔ اپنے چند قابل ذکر اور مشہور معاصرین کے تذکرے کے بعد جوشؔ صاحب نے میرے دور کی چند عجیب ہستیاں کے عنوان سے بعض غیر اہم اور غیر معروف لوگوں کے قلمی مرقعے لکھے ہیں ۔ ان قلمی تصویروں میں

انہوں نے معمولی اور غیر اہم کو اہم بنا کر پیش کرنے کا ایسا ہنر دکھایا ہے جو خاکہ نگاری کا نقطۂ عروج معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے قلم کے وسیلے سے مردہ لوگوں میں جان ڈالنے کا ہنر دکھلاتے اور فراموش کردہ لوگوں کو ناقابل فراموش بنا دیتے ہیں۔

جوشؔ صاحب نے چونکہ شخصی خاکوں میں بھی اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ پرانی تہذیبی قدروں کی نمائندگی خواہ کسی معروف شخص کے ذریعے ہوتی ہو یا غیر معروف شخص کے وسیلے سے، ان کو ایک ثقافتی نمائندے کے طور پر پیش کیا جائے۔ ان کے لئے انسان اور تہذیبی مظاہر دونوں کے بیان کا زاویہ ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آمیز ہے۔ تہذیبی مظہر کے طور پر انہوں نے ایک مقام پر عید کا ایک پہلو یوں دکھایا ہے۔

''عید گاہ سے پلٹا تو یہ دیکھتا ہوں کہ بڑی سریلی آواز میں میرے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے میرے باپ کا دربار جما ہوا ہے۔ احاطے میں وہ ہجوم ہے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔ صحن گئے ایک گوشے میں گوٹے پٹھے کے انگرکھے پہنے اور سروں پر گول گول منہ یلیں رکھے ہوکے چھلب دار دف بجا بجا کر گا رہے ہیں اور چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے سوئیوں اور شیر خرمے کے تھال حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں، اور خاص دان وعطر دان گردش کر رہے ہیں .....اور سپاہی برہنہ تلواریں ہاتھ میں لئے سلامیاں دے اور انعام لے رہے ہیں.............

یہ اور اس طرح کے ان گنت اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوشؔ صاحب کو تہذیب و ثقافت کے کتنے باریک اور نازک ارتعاشات کو ریکارڈ کرنے اور گرفت میں لینے کا ہنر آتا ہے۔ وہ جوٹی .ایس .ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ''جب فن کار خود کو لکھتا ہے تو وہ دراصل اپنے عہد کو لکھتا ہے سو جوش ملیح آبادی نے بھی یادوں کی برات کی صورت میں ایک پورے عہد اور جاہ و جلال پر مبنی متمول تہذیبی علامتوں کو محفوظ کر دیا ہے۔

☆☆☆

تجسیم محسوسات کا شاعر

شائستہ رضوی

جوش ملیح آبادی ایک عہد ساز شاعر ہیں جن کی فکر و دانش میں ڈوبی ہوئی شاعری اور ذہنوں کو گنگ کر دینے والی قوت متخیلہ کا اثر آنے والی کئی صدیوں پر رہے گا۔ جوش کے کثیر الجہت سرمایۂ سخن میں ایک بات جو انھیں اکابرین ادب میں نمایاں ترین مقام دیتی ہے بلکہ اپنی بوقلمونی اظہار کی وجہ سے وہ جس اچھوتے اور انوکھے سنگھاسن پر متمکن ہے وہ ان کی بسیط قوت مشاہدہ رسا قوت متخیلہ کی ملکۂ سخن سے ہم رفتاری ہے اس بے پایاں قوت اظہار کے باوصف بھی جو شاعر اس بات کا شاکی ہو کہ

تو سمجھتا ہے کہ جو کہنا تھا شاعر کہہ گیا
پوچھئے شاعر سے وہ کیا کہہ سکا کیا رہ گیا

کون جانے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

اور جب کیف کم کو اشعار میں ڈھالنے پر آئے تو محسوس کو موجود بنا دے۔ جوش کی شاعری کا یہی وصف آج میری گفتگو کا سرنامہ ہے۔

کلام جوش میں خواہ وہ نظم ہو یا غزل رباعی ہو یا قطعہ تجسیم محسوسات کی مثالیں رنگا رنگ پھولوں کی طرح بوستان شعر کو مرصع کرتی نظر آتی ہیں۔ کہیں جاہوں کا گلستاں ہے تو کہیں بانیوں کی

دھنک ہے کہیں ان کے ذہن کو رقص کی ترچھی چھڑی تو کہیں آواز کی آڑی پھوار میں صراط مستقیم نظر آتا ہے۔ جس کا قامت ذہن سرو دلیل ہو اور جس کے شعری سفر کا احاطہ سمندر تھے کہ مترادف محاسن شعری کا ایک طلسم ہوشربا ہے خود فرماتے ہیں۔

میں شدت وجود سے نا دیدنی ہوں جوشؔ
میں کثرت ظہور سے نا آفریدہ ہوں

اس اعجاز بیانی کا خود جوش کو بھی بے پایاں احساس اور ادراک تھا۔

الفاظ کو بخشتا ہوں روئے صنام
آواز کو آنکھوں سے دکھا دیتا ہوں

جوش کے کلام میں ایسے صوتی اور صوری مرقعے بے حد دل نشیں ہیں مگر ان کا یہ تخلیقی عمل ابدیت سے ہم کنار اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس کو اپنی فکری شاعری میں برتتے ہیں یا وہ ذہنی اور قلبی کیفیات اور غیر تصورات کی تجسیم مرئی حوالوں سے کرتے ہیں جس میں ایک نئی ساحرانہ ہم آہنگی معرض وجود میں آئی ہے جو ان کی قوت متخیلہ اور قوت مشاہدہ کے ملکۂ ناطفہ کے ہمرکاب ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے۔

کلملاتی مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح
سطح پر تالاب کی پڑتے ہیں حلقے بار بار
یونہیں دل کی لرزش پیہم کے ہاتھوں ہر نفس
میری چشم تر میں رہتی ہے تمنا بے قرار

یہ معجز بیانی نہیں تو اور کیا ہے کہ شاعر ایک ہی ترکیب میں آنکھوں کی نمی کو تالاب سے مچھلیوں کی شوخی کو تمنائے قلبی سے اور پانی میں پڑنے والے حلقوں کو دل کی لرزش پیہم سے متصور کرتا ہے۔

ایک دلکش ملیح چہرے پر
صبح کی ہیں صباحتیں طاری
جیسے نمکین چیز میں اے جوشؔ

ایک ہلکی مٹھاس کی دھاری

''سنبل وسلاسل'' اور سموم وصبا کے دور کی شاعری میں جوش خصوصاً مظاہر قدرت کی حسّیات سے انتہائی لطیف حد تک جڑے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کلیوں کے چٹکنے کو فطرت کی دستک سمجھ کے چونک جاتے ہیں۔ایک رباعی میں اس کی عکس بندی دیکھئے۔

سر سے نزدیک ہو کے ایک طائر
یوں اڑا صبح نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے مجھ کو
گیت اس طرح شہ پروں کے سنائے
ذہن سے جس طرح کہ کوئی بات
یاد آتے ہی محو ہو جائے

جوشؔ کو الفاظ کا جادوگر کہا جاتا ہے جس کے قلم کی جنبش سے الفاظ صف در صف پرے جمائے منتظر اذن سفر نظر آتے ہیں مگر جب یہی شاعر کم سے کم الفاظ میں اور لطیف ترین پیرائے میں کسی اچھوتی کیفیت کو منظوم کرے تو ''چاند کے انتظار میں تارے'' فاختہ کی آواز'' ''آواز کی سیڑھیاں'' اور ان کے ہم پایہ نظمیں تخلیق ہوتی ہیں۔

آئے وہ اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا سبک ہوئے تارے

یہاں محبوب کی آمد سے اشکوں کے تھمنے اور تاروں کے ماند ہونے میں جو کیفیاتی توازن برقرار رکھا ہے وہ اس سہل ممتنع شعر کو کیف آگیں اور مسحور کن بنا دیتا ہے۔

اپنی حدّ وفا ہوئی محسوس
ان کی آواز پا ہوئی محسوس

ایسے لطیف اشعار کو تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

اب حسن فطرت کے سب سے بڑے شاہکار احسن تقویم انسان اور انسان کی کیفیت قلبی اور معاشی مدوجزر سے پیدا ہونے والی بے چارگی کی لفظی تجسیم کا مشاقانہ مظاہرہ ملاحظہ فرمائیے۔

خشک ہو کر سایہ بخشی کی نہیں رہتی جب آس
حالت اشجار یوں اس وقت ہوتی ہے سقیم
جسے آنکھوں میں گدا کی دیکھ کر عزم سوال
سر جھکا لیتا ہے فرط شرم سے مفلس کریم

اس قطعہ میں شاعر نے کیا نادر استعارہ تراشا ہے کہ اس کیفیت پر ہر ہر پہلو سے منطبق ہو جاتا ہے۔
اسی قبیل کی ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا پر شور ہے اور ابر بے موسم کی یورش سے
لب ساحل شگفتہ چاندنی مرجھائی جاتی ہے
یونہیں آزردۂ انفاس آئینے کی سی حالت
عزیزوں کی شکر رنجی کی تہہ میں پائی جاتی ہے

کوئی بھولا بسرا نغمہ سنائی دے تو قوت سامعہ اور قوت ناطقہ شاعر کے تخیل میں یوں ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج
وہ نغمہ کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر
جسے چھیڑتا تھا کوئی مہ لقا
کچھ اس طرح نغمے کا ہر زیر و بم
میری سمت آنکھیں اٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح
کوئی بھولا بسرا ہوا آشنا
سر راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

جوش کی فکری شاعری میں بھی اس معقول کو محسوس میں ڈھالنے کا عمل ان کے تخلیقی سوتوں

میں حرف وفکر کی یکجائی اور یکتائی کی غمازی کرتا ہے۔ حالانکہ اس میدان میں ایسے محاسن شعری کو ترسیل تصورات کا ذریعہ بنانا نہ صرف انتہائی محال ہے بلکہ ہماری شاعری میں تو ناپید ہے۔ کیونکہ یہاں اس تیور کی تمثیلیں بجی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عروس دانش فردا الٹ رہی ہے نقاب
دمک رہی ہے انگوٹھی چمک رہا ہے بلاق

یہاں تک کہ اس شاعر بے بدل نے جب سائنسی تحقیقات اور ایجادات جیسے خشک موضوع پر اپنے قلم کو جنبش دی ہے وہاں بھی ایسے ایسے شہ پارے تخلیق کئے ہیں۔ ''موجد ومفکر'' جیسی اعلیٰ پائے کی نادر نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک مختصر سے شعر سے اس بات کو واضح کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

ذرّے کو ہتھیلی پہ جو دم بھر رکھا
محسوس ہوا نظام شمسی کا دباؤ

میری گفتگو جس نہج پر آ گئی ہے بلکہ اس کا رخ جس طرف مڑ گیا ہے اس کی ذہنی اور سائنسی ارتقاء کی شاعرانہ خلاقی اور پیکر تراشی ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے اس میں اپنے طور پر ایک جداگانہ اور انکشافاتی تخلیق کے تمام امکانات موجود ہیں.....

یہ سطریں لکھتے ہوئے ذہن میں لکھ رہی ہیں انگلیاں، زندگی اور اس قبیل کی متعدد نظمیں حافظہ کے معیار میں موجود ہیں جوش کی تمثیلیں اوج معنیٰ کو فروغ کہکشاں دیتی ہوئی اور بے زباں افکار کے منہ میں زباں دیتی ہوئی۔

بے صدا معنی کو شیشے کی کھنک دیتی ہوئی
ولولوں کے آسمانوں کو دھنک دیتی ہوئی
کانپتے میزان پر ارض و سما کو تولتی
ذہن کے عقدوں کو لرزاں ناخنوں سے کھولتی

آخر میں اپنے خیالات کو سمیٹتے ہوئے جوش کی نمائندہ ترین نظموں میں سے ایک نظم زندگی کے ایک انمول بند پر اپنی گفتگو کا اختتام کرنا چاہوں گی۔ اسکے متعدد بند ایسے ہیں کہ اسے آپ کتنی ہی

عمیق مایوسی اور اتھاہ تنہائی میں پڑھیں تب بھی زندگی میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور برنائیوں کے ساتھ رجائیت کی راہوں میں بانہہ پکڑ کر یوں لے جاتی ہے کہ حیات میں بلکہ جوش کی زبان میں قوت حیات میں از سر نو یقین ہو جاتا ہے اور یہی رجائیت جوش کے کلام کا حاصل ماحصل بھی ہے کہ اس اتھاہ فکر اور انفس و آفاق میں ڈوبنے اور اس کی گھتیاں سلجھانے کے کٹھن راستوں سے گزرنے کے لیے یہ طرز فکر ناگزیر بھی ہے اور میرے نفس مضمون سے متصل بھی۔

زندگی مڑتے ہوئے پتوں پہ بوندوں کی کھنک
صبح سرما کی کرن، شام بہاراں کی دھنک
بول تتلی کی اڑان آواز کوندے کی لپک
کوکتی برکھا میں سارنگی کے تاروں کی لچک

شہر تن میں پھول والوں کی مکیں ہے زندگی
گردن آفاق میں چمپا کلی ہے زندگی

سر پہ سہرا، بر میں جوڑا، ہات میں قند و نبات
چال میں گنگا کی لہریں، زلف میں برکھا کی رات
سانس میں بوئے سمن، لہجے میں عود سومنات
زندگی رنگوں کے سائے میں گزرتی اک برات

جسکی قرنوں حجلۂ قدرت میں رکھوالی ہوئی
تتلیوں کی مسمساتی چھاؤں کی پالی ہوئی

اسی نظم کی ایک اور امر بیت ملاحظہ فرمائیے۔

اک سنہری تان کی زنجیر بل کھاتی ہوئی
ایک انگڑائی دھنک کے پل پہ لہراتی ہوئی

یہ صرف چند مثالیں ہیں اور اس حسن شعری کی اتنی مثالیں ہیں کہ یہ صرف ایک اشاریہ ہے۔

☆☆☆

جوش کی رباعیاں

فرید پربتی

جوش بیسویں صدی کے نمائندہ اور رجحان ساز شاعر ہیں۔ وہ اردو ادب میں لہجے کی صلابت، موضوعاتی تنوع، متضاد رویہ، جذبہء تشکیک اور بے پناہ لفظی سرمایہ کی بنا پر منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ جوشؔ صحیح معنوں میں اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں نوکلاسکیت Neo-Classics کے آثار ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موجود کلاسیکی اور جدید رویوں کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ لہجے کی جو صلابت ملتی ہے وہ نئے شعری آہنگ کے لئے راہیں ہموار کرتی ہے۔

جوشؔ نے اردو ادب میں تقریباً تمام مروجہ اصناف اور شعری ہیتوں کو تخلیقی اظہار کے لئے بروکار لایا ہے۔غزل، نظم، مرثیہ قطعہ اور رباعی کا اتنا وقیع سرمایہ انہوں نے اردو ادب کو دیا ہے۔جس سے ادبی تاریخ مرتب کرنے والا کبھی اغماض نہیں برت سکتا ہے۔ان کی فنی اور فکری تربیت اگرچہ لکھنؤ کے روایتی دبستان کے تحت ہوئی ہے۔اس کے باوجود اُن کی غزل میں نیا لب ولہجہ اور ایک نوع کی تازگی نظر آتی ہے۔ان کی نظمیں فکروفن کی پختگی اور تازہ کاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں اور موضوعاتی سطح پر وسیع کینوس رکھتی ہیں۔جدید مرثیہ کی بنیادیں مستحکم کرنے میں جوش نے انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔اور بقول فضل امام۔

''جوش نے نئی راہ نکالی اور اردو مرثیہ کو عصری حسیت اور تقاضوں سے ہم

آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو بیسویں اور اکیسویں صدی کے
لئے بھی لازوال بنادیا اس طرح سے جوش نے اردو مرثیہ کی تاریخ کو بے
کراں وسعتوں سے ہم کنار کر دیا ہے۔''[۱]

جوش اردو ادب میں جس طرح منفرد نظم گو شاعر ہیں اسی طرح وہ اہم رباعی نگار بھی ہیں انہوں نے جس سلیقہ مندی سے دیگر مروجہ اصناف اور شعری ہیتوں کو تمام تر فنی لوازمات کے ساتھ اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اپنایا ہے بالکل اسی طرح انہوں نے صنف رباعی کے لامحدود امکانات کو بھی تخلیقی اظہار کے لئے آزمایا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج، بندش کی چستی، وحدتِ تاثر، لطف بیان، تسلسل فکر، نادرہ کار تشبیہات اور حسین استعارات جوش کی رباعیوں کے خاص اوصاف ہیں۔ انہوں نے اس صنف سخن کو نا صرف ایک محدود فضا سے باہر نکال کر موضوعاتی تنوع پیدا کیا بلکہ انسانی جذبات واحساسات، عقل و وجدان اور جنون وخرد کی نئی نئی جہتیں تلاش کر کے ان کے تمام پہلوؤں کو اجاگر بھی کر دیا۔ جوش نے صحیح معنوں میں رباعی کو جدید نظم کے برابر کھڑا کر کے اس میں زندگی کی وسعت پیدا کر دی ہے۔

جوش حقیقی معنوں میں اعلیٰ پائے کے رباعی نگار ہیں ۔ انہیں اردو شعرا میں یہ امتیازی وصف حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ امداد امام آثرؔ نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی رباعی کو حد نظر رکھ کر یہ رائے دی تھی ۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر دو بزرگوار رباعی نگاری کے اعتبار سے بہت قابل
قدر ہیں۔ بلکہ اردو شعرا میں بھی یہی حضرات ہیں جنہوں نے رباعی نگار کی
شرم رکھ لی ہے۔''[۲]

اگر ان کے پیش نظر جوش کی رباعیاں ہوتیں تو وہ ضرور اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرتے۔

جوش کی رباعیوں میں دو پہلو ایک فنی (A r t i s t i c) اور دوسرا جمالیاتی (Aesthetic) موجود ہیں۔ ان میں ایک طرف اصول، شعور، غور وفکر، اور معنیٰ کے تشریحی نظام سے دوسری طرف جمالیاتی قدروں کے تحت وجدان، ذوق، لاشعور، جذبۂ احساس، کلچر اور زبان کی روایت اور مزاج سے بھی واسطہ جابجا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ ان کی رباعیوں میں فنی دقائق

تخلیقی تجربوں کے تابع مہمل بن کر ابھر آتے ہیں۔

جوش کی رباعیاں زبان اور بیان کی سطح پر اعلیٰ اور معیاری ہیں وہ ایک ایسے ادبی ماحول کے پروردہ ہیں جہاں روزمرہ اردو محاورے کے محل استعمال پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ وہ ایک ادبی خانوادے کے چشم و چراغ بھی تھے۔ان کے پردادا فقیر محمد خان گویاؔ نہ صرف صاحب دیوان شاعر تھے بلکہ ایک علمی شخصیت بھی تھے۔وہ ناسخ کے خاص شاگرد بھی تھے ان کے دادا اور والد بھی سخن دان و سخن شناس تھے اس طرح زبان کی صفائی ، بندش الفاظ ، تراش ، خراش اور محاورہ بندی ان کو وراثت میں ملی تھی۔اس ادبی اور لسانی پس منظر کے بارے میں جوش کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

طبع رسا کی زلفِ دوتا میں گندھا ہوا
میرا تسلسلِ ادبِ خانداں بھی ہے
تہذیب فکر کشورِ دہلی کے ساتھ ساتھ
فردوسِ لکھنو کی کھنکتی زباں بھی ہے

جوش کو ابتدائی مشق کے دوران لسان الہند عزیز لکھنوی سے مشورۂ سخن کرنے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔وہ لکھنو کے قدیم رنگ سخن کی آخری یادگار تھے انہیں نہ صرف زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل تھی بلکہ اپنے پیش رو اساتذہ کی طرح شستہ و رفتہ زبان استعمال کر دی ہے اور لکھنوٗ کی مستند اور ٹکسالی زبان کو بھی اپنے اظہار کے دوران ترجیح دی۔اس فنی اور فکری ماحول میں جوشؔ نے مرصع کاری کا فن سیکھا۔البتہ ہر بڑا تخلیقی ذہن اپنے تخلیقی اظہار کے لئے اپنی زبان خلق کرتا ہے۔ جوشؔ نے وہی کیا۔ان کی زبان اتنی پختہ اور شستہ و رفتہ ہے کہ معاصر ادب میں اس کی نظیر ملنا محال ہے اور ہمارے موجودہ دور کے تخلیق کاروں نے ان سے لسانی داؤ و پیچ سیکھے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن کی رائے سے مزید وضاحت ہوگی:

''جوش کا کلام لفظوں کی انمول اور بے مثال قوس قزح ہے رنگ ، احساس اور تصور کا ایسا خزانہ جس کی مثال سودا، نظیر اور انیس کے علاوہ ہزار سال کے

ادب میں ناپید ہے'' ۳ے

ظفر اقبال کے مجموعے ''گل آفتاب'' کی غزلوں کی زبان اور جوش کی نظم ''پند نامہ'' اس کا بین ثبوت ہے۔ جوش نے زبان و بیان کے تجربے کئے ہیں اس کی کامیاب تقلید ''گل آفتاب'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انیس و دبیر کے بعد حسن بیان اور لطف زبان کے علاوہ ٹکسالی اور مستند زبان سے اگر کسی رباعی نگار نے اپنی رباعیوں کو آرستہ کیا ہے وہ جوش ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور محاوراتی زبان کو جس سلیقے سے انہوں نے رباعی میں جگہ دی ہے وہ ان کا فقید المثال کارنامہ ہے یگانہ چنگیزی نے بھی لکھنؤ کے مخصوص محاوروں کو اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے مگر وہ ان سے لطف سخن پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ایک خود آگاہ تخلیق کار کی طرح جوش اپنے اس منفرد کارنامے سے ضرور واقف تھے ان ہی باتوں کو مدنظر رکھ کر جوش نے کہا ہے ۔

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہات ڈالا ہم نے

باقی نہیں اک شعور رکھنے والا
صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں
الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا

جوش کو زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل ہے اسی وجہ سے ان کی ہر رباعی فنی ارتکاز وحدت فکر، بے ساختہ پن، زور بیان اور قادر الکلامی کا ایک خوبصورت مرقع بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں اور وہ جس موضوع کو بھی اپنی رباعیوں میں پیش کرتے ہیں اس کو فنی تکمیت اور بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ چند رباعیاں ملاحظہ کیجئے ۔

ممنوع شجر سے لطف پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
مشہور گر کا ثمیر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

وہ آئیں تو ہوگی تمناؤں کی عید
مے زہرہ بنی تو روح مستی ناہید
ارمان بڑھے گلے میں ڈھولک ڈالے
تھرکی کو لٹھے یہ ہات رکھ کر امید

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقد خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہو تا ہوں میں

جوش کے معاصرین خصوصاً رواںؔ، فراقؔ، امجدؔ اور یگانہؔ کی رباعیوں میں بھی اگر چہ فنی تکمیت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں البتہ وہ گرج، زور احتجاج اور وفور جو جوش کی رباعیوں کا خاصہ ہے ان کے یہاں ناپید ہے۔

جوش کی رباعیاں ان کی شخصیت کا ایسا آئینہ نما ہیں جن میں ہم جوش کو صحیح معنوں میں اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے صحیح طور سے ان کی رباعیوں پر صادق آتی ہے جو انہوں نے انکی نظمیہ شاعری کے بارے میں دی ہے۔

''جوش کی شاعری ان کے ذہنی ارتقاء کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کے جلال و جمال، حسن و قبح اور بلند و پستی کو بڑی خوبی سے منعکس کرتی ہے ان کی ذہنی کشمکش، فکری واماندگی، تصور پرستی سماجی عقائد کی جھلک

انکی ہزار ہا نظموں میں بکھری پڑی ہے۔''۳۹

اس طرح جوش کی رباعیوں میں ایک ایسا شعری کردار ابھر کر سامنے آتا ہے جو روایات سے متصادم ہے اور سماج قانون اور زندگی کے دیگر لازمات سے متعلق ایک مثبت سوچ رکھتا ہے۔

اس دہر میں اک نفس کا دھوکا ہوں میں
بجلی ہوں، بگولا ہوں، چھلاوا ہوں میں
گھبرائی ہوئی ہے جوش روحِ تحقیق
ہر ذرہ پکارتا ہے دنیا ہوں میں

یہ بزم گہہ عمل ہے بے نغمہ وصوت
اس دائرے میں ولولۂ روح ہے فوت
یک رنگی و یکسانیٔ اسلوبِ حیات
در اصل ہے ایک سانس لیتی ہوئی موت

جوش نے تکنیکی سطح پر رباعی کے لامحدود امکانات کو آزمایا ہے اس میں ڈرامائی عناصر شامل کر کے اپنے اسلوب اور طرز بیان کو زیادہ پر اثر بنایا ہے۔ وہ عموماً چھوٹے فقروں سے مکالمے کا کام لیتے ہیں۔ اس طرز بیان کے نمونے خیاؔم اور سرؔور کی رباعیوں میں بھی ملتے ہیں۔ اسی تکنیک کے ذریعے ایک چھوٹی سی رباعی ایک مکمل اور کامیاب ڈراما بن جاتی ہے اور بغیر نام کے کردار ابھر آتے ہیں اور اپنا مکالمہ بول کر چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کی رباعیاں فنی محاسن کے ساتھ ساتھ جمالیاتی کیف واثر کا مرقع بن جاتی ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

کل رات گئے عین طرب کے ہنگام
سا یہ وہ پڑا پشت سے آکر سر جام
تم کون ہو، جبریلؔ ہوں، کیوں آئے ہو
سر کار فلک کے نام کوئی پیغام

بے نغمہ ہے اے جوش ہمارا دربار
اب عالم ارواح میں تک آؤ بھی یار
یہ کون بلا رہا ہے "ہم ہیں اے جوش
آزاد، شرر، رفیع، شاعر، ابرار

بندے! کیا چاہتا ہے دام و دینار
یا دولتِ پابندہء زلف ورخسار
معبود!نہیں نہیں کوئی چیز نہیں
الا آگاہیٔ رموز و اسرار

جوش کی نظموں کی طرح ان کی رباعیاں بھی قوی اور توانا احساس کی پیداوار ہیں۔ موضوعاتی سطح پر ان کی رباعیوں کی کئی تہیں ہیں ان سب میں زیادہ دبیز تہہ حرکت وعمل کا پیغام ہے۔ وہ اپنی رباعیوں کا ڈھانچہ ان مظاہر پر کھڑا کرتے ہیں جن سے زندگی میں حرکت پیدا ہوتی ہے اس سے ان کی رباعیوں میں گرج اور بلند آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ اپنی فکر کے اس حرکی پہلو کے ڈانڈے وہ نتشے سے ملاتے ہیں۔ وہ نتشے کی طرح بے اصول اور بے راہروی کے سخت مخالف ہیں۔ نتشے نے دنیا کو فوق البشر Superman کا تصور دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان اپنی داخلی صلاحیتوں کو ترقی دے کر فوق البشر بن سکتا ہے۔ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور فکر انسانی کو تقلید کی بندشوں سے آزاد کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اس دور میں حریت فکر کا پیغام دنیا کو دیتا ہے جب فلسفہ اور سائنس دونوں حریت فکر کے منکر اور جبریت کے علمدار تھے۔ وہ کائنات کی اصل مادہ یا مادی نہیں گردانتے ہیں بلکہ ارادہ یا خواہش اقتدار کو گردانتے ہیں۔ فوق البشر کا ظہور اور تنازع للبقاء کا مطلب ماحول کے سامنے سر تسلیم خم کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے جنگ کرنا اور اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا ہے اس لئے صرف وہی افراد باقی رہیں گے جو باقی رہنے کے لئے جدوجہد کریں گے اس طرح نتشے کی رائے میں اصل حیات خواہش زیست نہیں بلکہ خواہش اقتدار ہے۔ جوش بھی زندگی کا اصل مقصد جدوجہد اور حصول اقتدار کو ہی گردانتے ہیں۔ وہ زندگی کے بارے میں نتشے کی طرح مثبت انداز نظر

رکھتے ہیں:

(۱)

قانون نہیں کوئی فطرت کے سوا
دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور مولیٰ بن جا
معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

جینا ہے تو جینے کی محبت میں مرو
غارِ ہستی کو نیست ہو ہو کے بھرو
نوعِ انساں کا درد اگر ہے دل میں
اپنے سے بلند تر کی تخلیق کرو

انساں کی تباہیوں سے کیوں ہے دلگیر
کا کل میں بدل جائے گی کل یہ زنجیر
اس آدم فرسودہ کے زیر تخریب
اک آدم ِنو کی ہو رہی ہے تعمیر

جوش کے نزدیک فوق البشر کو پیدا ہونے میں ماحول، مذہب، قانون اور تہذیب مانع ہیں کیونکہ ان کی تشرع عملی جامہ پہنانے والے اور تاویل کرنے والے ان کی اصل روح سے واقف نہیں ہیں۔اسی وجہ سے وہ ماحول، قانون اور تہذیب کے اخلاف احتجاج کرتے ہیں۔

آزادیٔ فکر و درسِ حکمت ہے گناہ
دانا کے لئے نہیں کوئی جائے پناہ
اس اژدرِ تہذیب کے فرزندِ رشید
یہ مذہب و قانون عیاذاً باللہ!

''للہ ہمارے غر فہء دیں کو نہ چھوپ''
''بل کھائیں گے مجتہد بگڑ جائیں گے پوپ
یہ کہتی چلی آتی ہیں لاکھوں عقلیں
پہنے ہوئے آباء کے پرانے کنٹوپ

جوش تنازع للبقاء میں کامیاب انسان کوفوق البشر کی اعلیٰ مثال کہہ دیتے ہیں اوراس کی بیعت کرنا فخر کا باعث سمجھتے ہیں۔

اے مر دِ خدا نفس کو اپنے پہچان
انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے ہات بڑھا
پڑھ کلمہء لا الہٰ الا انسان

جوش کی رباعیوں میں زندگی پرست رجحانات سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ان کی رباعیوں میں بصری پیکر وافر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔اگر چہ سمعی اور لمسی پیکر بھی موجود ہیں۔ان سے ان کے زندگی پرست رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اوراپنے ماحول اور اطراف و جوانب سے ان کا جو تعلق تھا وہ ظاہر ہو جاتا ہے اِسی وجہ سے ان کے یہاں خورشید، حاتم، ذرات، انسان۔دن رات، کا مگار، شہریار، دانش، جمود، انکار، اقرار، محدود، ضعیف، انوار، نظارہ، امید، ہنسنا رونا، مہتاب، آفتاب، فلک، قانون، تارے، مذہب، چاند، اژدر، موت، سانس، حسن، بے بسی جیسے الفاظ کا استعمال بتکرار پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنے اسلوب کوزیادہ سے زیادہ پراثر بنانے کے لئے مختلف شعری صنعتوں کے علاوہ تکرارِلفظ سے اپنے اسلوب اور شعری اظہار میں جان ڈال دی ہے۔

اے زاہد حق شناسو اے عالِم دیں
حضرت کا مقام ہے فقط خلد بریں
انسان ابھی چل رہا ہے گھٹنوں گھٹنوں
اور آپ کو ہے قربِ قیامت کا یقیں

خود سے نہ اداس ہوں، نہ مسرور ہوں میں
بالذات نہ روشن ہوں نہ بے نور ہوں میں
مختار ہے، مختار ہے، مختار ہے تو
مجبور ہوں، مجبور ہوں، مجبور ہوں میں

جوش کی رباعیوں کا ایک اہم پہلو منظر نگاری ہے۔ مناظر فطرت کے ساتھ ان کو جو لگاؤ ہے اسکا باضابطہ اظہار رباعیوں میں بطور خاص ہوا ہے۔ انہوں نے تشبیہات اور استعاروں کے ذریعے زبردست منظر نگاری کی ہے۔ جوش کو منظر نگاری پر غیر معمولی قدرت تھی نئی تشبیہات اور اچھوتے استعاروں اور تلازموں کی معنویت، جدید اور پراثر ترکیبیں، لفظ کی مزاج شناسی اور حروف واصوات سے بنائے ہوئے نقوش جوش کی تصویروں کو گویا اور متحرک بنا دیتے ہیں۔ جوش مناظر و مظاہر کو مجسم بنا دینا چاہتے ہیں۵۔ جس طرح محاکاتی کیفیت انہوں نے مناظر و مظاہر میں پیدا کی ہے اگر اس کو ادبی مصوری کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ منظر نگاری کے نمونے اردو کے دیگر اصناف خصوصاً مرثیہ اور مثنوی میں بدرجہ اتم موجود ہیں مگر جوش سے پہلے اس طرح رباعی میں منظر نگاری کم و کاست ہی موجود تھی۔ اس سے رباعی میں مقامیت زیادہ سے زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ البتہ بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

''مناظر قدرت کی تصویر کشی کے وقت نیچرل حالات کا نقشہ جوش کے جذبات کی رنگ آمیزی میں کسی قدر دھندلا ہو جاتا ہے اُن کا پیمانہ قلب جذبات سے اس قدر لبریز ہے کہ کائنات کے ہر ذرہ پر وہ جذباتی نگاہ ڈالتے ہیں۔''۶

بہر حال جوش کی منظریہ رباعیاں رباعی کے موضوعاتی منظر نامے کو وسیع کرنے کی اہم کوشش ہے۔

برسات ہے دل ڈس رہا ہے پانی
فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی

دل میں کبھی چبھتا ہے کلیجے میں کبھی
آڑا ترچھا برس رہا ہے پانی

ساحل، شبنم، نسیم، میدان، طیور
یہ رنگ، یہ جھٹ پٹا، یہ خنکی، یہ سرور
یہ رقص حیات اور دریا کے اُدھر
ٹوٹی ہوئی قبروں پہ ستاروں کا یہ نور

ناگن بن کر مجھے نہ ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل

جوش کی رباعیوں کے سرمائے میں اہم سرمایہ ان رباعیوں پر مشتمل ہے جن میں زندگی اور عقل وخرد کے مسائل خمریاتی انداز میں بیان کئے گئے ہیں:

''امجد حیدر آبادی'' کی رباعیاں جس طرح اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے سرمد سے قریب تر ہیں بالکل اسی طرح جوش اپنی رندانہ جسارت، جوش بیانی، نکتہ آفرینی، فنی پختگی، شاعرانہ مصوری اور طنزیہ لب و لہجے کی مناسبت سے عمر خیام سے قریب تر ہیں۔ شراب اور متعلقات شراب کے ذریعے اپنی بات کو موثر ڈھنگ عطا کرنا اردو فارسی اور عربی شعرا کا اہم رجحان رہا ہے عربی میں اخطل اور ابونواس اور فارسی میں حافظ وخیام نے اس کا سہارا لے کر شاعری کے دلکش اور لطیف نمونے پیش کیے ہیں۔ اردو غزل میں خمریاتی شاعری ریاض خیر آبادی اور عبدالحمید عدم کے یہاں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ رباعی میں خمریہ مضامین پر سب سے زیادہ رباعیاں جوش کے یہاں ملتی ہیں۔ اس بنیاد پر ''اگر ہم بقول سلام سندیلوی جوش کو اردو کے خیام کا لقب دیں تو بیجا نہ ہو''[8] جوش خمریات کے پردے میں خیام کی طرح حیات وممات اور زندگی کے دیگر نکات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔

البتہ وہ شراب کو بادۂ عرفان میں نہیں بدلتے ہیں بلکہ عام شراب ہی رہنے دیتے ہیں۔

مفلوج ہر اصطلاح ایماں کر دے
فردوس کو رہین طاق نسیاں کر دے
ساقی ہے، مغنی ہے، چمن ہے، مے ہے
اس نقد پہ سو اُدھار قرباں کر دے

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کر کے
کیا پائے گا توہین جوانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

باغوں پہ چھا گئی جوانی ساقی
سنکی وہ ہوائے زندگانی ساقی
ہاں جلد انڈیل جلد بہتی ہوئی آگ
آیا وہ برستا ہوا پانی ساقی

ہر علم و یقیں ہے اک گماں اے ساقی
ہر آن ہے اک خواب گراں اے ساقی
اپنے کو کہیں رکھ کے میں بھولا ہوں ضرور
لیکن یہ نہیں یاد کہاں اے ساقی

جوش کی وہ رباعیاں کافی جاندار ہیں جن میں انہوں نے طنزیہ اور تضحیک کا پہلو اپنایا ہے اور ایک ہوش مند طنز نگار کی طرح اپنے دور کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے سماج میں پیدا شدہ ناہمواریوں پر نشتر زنی کی ہے۔ ادب کا کام نظام فکر تیار کرنا نہیں ہے بلکہ نظام

فکر کے لئے بنیادی مواد فراہم کرنا ہوتا ہے اور اپنے معاصرین کو اپنے عصر کی ناہمواریوں اور ناآسودگیوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ ایک دور کی تاریخ لکھنے والا جہاں خاموش رہتا ہے وہاں اس دور کا ادب بولتا ہے۔ سودا کا قصیدہ 'تضحیک روزگار' اس کی عمدہ مثال ہے۔ جوش نے اپنے دور کی ناہمواریوں اور ناآسودگیوں کے ساتھ قدروں کی شکست و ریخت پر زبردست احتجاج کیا ہے۔ جوان کی ہوش مندی اور سماجی شعور کا بین ثبوت ہے۔ اس نوع کی رباعیوں میں گرج تیکھاپن اور تندی سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔

تھے پہلے کھلونوں کی طلب میں بیتاب
پھر حسن کے جلوؤں سے رہے بے خور و خواب
اب ہیں زن و فرزند پہ دل سے قربان
بوڑھے ہیں مگر ہنوز بچے ہیں جناب

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انسان کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق ان کو
بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

پر ہول شکم عریض سینے والو
خوں قوم تہی دست کا پینے والو
تم اہل خرد سے کیوں نہ رکھوگے عناد
خیرات پر احمقوں کی جینے والو

جوش کی رباعیوں کا ایک اور موضوع حسن وعشق ہے۔ جوش کا طبعی میلان اگرچہ تغزل اور معاملہ بندی کی طرف نہیں تھا بلکہ عقل وخرد اور شعور و وجدان کی طرف تھا پھر بھی ان کے یہاں بہت سی رباعیاں ایسی ملتی ہیں جن میں حسن وعشق کے تجربات اور واردات قلبی کو بیان کیا گیا ہے۔

جوش اپنی عشقیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی (لوگ کہتے ہیں) کمی ہے جسے آہ وفغاں اور سوز وگداز کہا جاتا ہے اگر ایسا ہے تو اسکی ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامران پر۔ میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے ہیں کہ جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے واضح رہے کہ عاشق کامیاب ٹسوے نہیں بہایا کرتا" ۹

اسی وجہ سے ان کی عشقیہ رباعیوں میں بھی اضمحلال کے بجائے حرکت، سوز کی بجائے گرمی، دروں بینی کے بجائے نشاطیہ کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری فراق کی عشقیہ شاعری سے اس وجہ سے مختلف ہے کہ وہ حسن کی تجسیم کرتے ہیں البتہ جوش حسن کی تجسیم بھی کرتے ہیں اور اس کو چھوتے بھی ہیں۔ اسی سلسلے میں پروفیسر شکیل الرحمن کی یہ رائے کافی اہمیت رکھتی ہے:

"جوش نے حسن کو ایک مثبت قدر تصور کیا ہے جو جبلت کی پیداوار ہے۔ حسن سے انبساط حاصل ہوتا ہے" ۹

اسی طرح جوش کی عشقیہ رباعیاں بھی انفرادی لب و لہجے، حسن بیان، بے ساختہ پن کے ساتھ تخلیقیت اور فنی تکمیت کے اعلیٰ مرقعے ہیں۔

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پئے سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے روکے سحر کو روکے کوئی

جلوؤں کی ہے بارگاہ میرے دل میں
غلطیدہ ہیں مہرو ماہ میرے دل میں
اس دورِ خرد میں عشق گم ہو جاتا
ملتی نہ اگر پناہ میرے دل میں

اے رونق لالہ زار واپس آجا
اے دولت برگ وبار واپس آجا
ایسے میں کہ نو بہار رہے خلد بدوش
اے نازشِ نو بہار واپس آجا

اوروں کو بتاؤں کیا میں گھاتیں اپنی
خود کو بھی سناتا نہیں باتیں اپنی
ہر ساعت خوش ہے حال مسروقۂ وقت
قدرت سے چھپا رہا ہوں راتیں اپنی

مختصراً جس طرح جوش نے اردو نظم کو لہجے کی صلابت، موضوعاتی تنوع، اور بے پناہ لفظی سرمایہ کے ذریعے نیا موڑ دیا اُسی طرح رباعی کو نئے موضوعات اور اپنی منفرد طرز ادا کے ذریعے ایک نئی توانائی اور طاقت بخش دی ہے اُن کی رباعیاں اردو ادب کے ادبی سرمایہ میں صحیح معنوں میں ایک اضافہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف رباعی کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے بلکہ اس کو جدید نظم کے برابر کھڑا کر کے اس میں زندگی کی وسعت پیدا کر دی ہے۔

☆☆☆

....(اشاریہ)..

(۱) انتخاب کلیات جوش، فضل امام ص۲۴، (۲) کاشف الحقائق (جلد دوم) نواب امداد امام اثر صفحہ ۲۸۶، (۳) جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مقالہ فکر جوش ص۲۰، مرتب قمر رئیس، (۴) جوش ملیح آبادی انسان اور شاعر، پروفیسر احتشام حسین ص۱۱۵، (۵) تاریخ ادب اردو (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک)، (جلد چہارم) سیدہ جعفر ص۲۸۳، (۶) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین ص۱۳۵، (۷) اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء)، فرمان فتح پوری ص۱۷۲، (۸) اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۵۳۷، (۹) سید احتشام حسین - ذوق ادب اور شعور، ص ۲۲۵
(۱۰) آجکل دہلی، جوش نمبر اپریل ۱۹۹۵ء ص۲۶۴

شخصی مرثیہ گوئی اور جوش

لئیق رضوی

اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت بہت قدیم ہے۔لیکن بدقسمتی سے ہمارے محققین اور ناقدین نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی اور ہم اس ادبی ورثے سے کٹتے چلے گئے۔ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ اس کا بڑا سرمایہ یا تو ضائع ہوگیا یا وقت کے دھندلکوں میں کھوگیا۔اردو میں جو شخصی مرثیہ میں تلاش کرسکا ہوں، ان میں سب سے قدیم شاہ برہان الدین جانم کا ہے۔شاہ برہان الدین جانم نے یہ مرثیہ اپنے والد شاہ میراں جی کی وفات (۹۷۰ھ) پر کہا تھا۔اس کے بعد جعفر زٹلی، عبدالحی تاباں، غالب، مومن، ناسخ، میر انیس، حالی، اکبر، اقبال، محمد علی جوہر، چکبست اور سرور جہان آبادی، سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ پروان چڑھتا گیا اور آج بھی بدستور زندہ و جاری ہے۔(اس بارے میں میں اپنے مقالے 'اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت' میں تفصیل سے ذکر کرچکا ہوں)

اردو میں مرثیہ عربی، فارسی سے آیا، لیکن یہاں کربلائی مرثیوں کو کچھ ایسا عروج ملا کہ یہ صنف ان سے ہی پہچانی جانے لگی۔اردو میں مرثیہ، کا مطلب کربلائی مرثیہ ہے۔باقی مرثیہ شخصی مرثیہ کہلائے۔شخصی مرثیہ کی نہ کوئی خاص ہیئت مخصوص ہے اور نہ ہی اجزائے ترکیبی ہی طے ہیں، لیکن ایک مکمل اور سلسلے وار شکل بنانے کے لئے، شخصی مرثیہ میں جو اجزا ضروری ہیں، ان میں چہرہ، وصف اور بین بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔بعض شعرانے اس میں دعا کا باب بھی جوڑا ہے۔رثائیت، اس کی بنیادی شرط ہے۔محض کسی کی موت کے حوالے یا ذکر سے کوئی نظم شخصی مرثیہ نہیں کہی جاسکتی۔البتہ

اس باب میں، ان تعزیتی رباعیوں اور قطعات تاریخ وفات کو بھی رکھا جا سکتا ہے، جن میں رثائی لے ہے۔

۲۰ویں صدی میں، جن شعرا نے شخصی مرثیہ کو اعتبار بخشا، ان میں جوش ملیح آبادی کا نام سر فہرست ہے۔ شخصی مرثیہ گوئی بھی جوش کا فن خاندانی ہے۔ پردادا فقیر محمد خاں گویا سے لے کر والد بشیر احمد بشیر تک، جوش کے اسلاف کے یہاں شخصی مرثیہ نگاری کا قیمتی سلسلہ ملتا ہے۔ فقیر محمد خاں گویا نے اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے نائب السلطنت، معتمد الدولہ نواب آغا میر کی موت پر، پر درد مرثیہ کہا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہائے دنیا سے اٹھ گیا وہ امیر
جس کا عالم میں تھا نہ کوئی نظیر
اس بن آنکھوں میں ہے جہاں تاریک
تھا وہ گویا کہ مہر عالم گیر
ملک عزت کا آسمان تھا وہ
چرخ ہمت کا تھا وہ ماہ منیر
دفعتاً یوں اٹھالیا اسے ہائے
کیا کیا تو نے او فلک بے پیر

(ڈاکٹر ناہید عارف، گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات (لکھنو ۱۹۹۹)

جوش کے کلام میں، مجھے گیارہ شخصی مرثیہ نظر آئے۔ ان میں سے دو، ان کے والد بشیر احمد بشیر، اور باقی ایک ایک بڑی بہن، دوست روپ سنگھ، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مرزا احسن شرر لکھنوی، علامہ راشد الخیری، حکیم صاحب عالم اور ایک نامعلوم شہید وطن کی یاد میں ہیں۔ حکیم صاحب عالم کا مرثیہ، کوئی علاحدہ نظم نہیں ہے، یہ اشعار جوش کی ایک طویل نظم (اپنا مرثیہ) کا ہی حصہ ہیں۔ جوش نے، جگت موہن لال رواں کی موت پر بھی ایک مرثیہ کہا تھا، لیکن تلاش کے باوجود وہ مجھے حاصل نہ ہوسکا۔ جوش کے مرثیوں کو، موٹے طور پر تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلا عزیزوں کے مرثیے، دوسرے دوستوں کے مرثیے اور تیسرے، قومی لیڈران کے مرثیے، جن سے جوش متاثر

تھے۔

جوش نے شخصی مرثیہ گوئی کو لفظ کا شکوہ اور خطیبانہ لہجہ بخشا ہے۔ جذبات اور منظر نگاری کے نئے دریچے کھولے ہیں۔ ان کے شعری پیکر زندہ اور متحرک ہیں۔ انھوں نے لفظوں کو خیال کی ڈور میں یوں گوندھ دیا ہے کہ ان میں خوبصورت ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ بالکل فٹ۔ نہ ہٹایا جاسکے نہ ہی بدلا جاسکے۔ ایک دوسرے کو جوڑتے اور بڑھاتے لفظوں کا ایسا تار، جو خیال کے فطری بہاؤ کو نہ روکے نہ دھیما یا تیز کرے۔ انھوں نے لفظوں کو یوں سلیقے سے چن دیا ہے کہ ان میں خیال کا چہرہ نظر آتا ہے۔ لفظوں کی یہ چلتی پھرتی تصویریں دل کھینچتی ہیں۔

جذباتیت، جوش کے شخصی مرثیوں کا غالب رنگ ہے۔ یہ اشعار یادوں، جذبات اور تخیل کا خوب صورت میل ہیں۔ یادوں کی کوکھ سے نکلے جذبات، ان اشعار میں بے پناہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ رشتے داروں اور دوستوں کے مرثیوں میں جذبات کے یہ لَے اور تیز ہے۔ جوش کے کچھ مرثیے، مثلاً بہن اور والد کے مرثیے، انتہائی ذاتی غم کا نتیجہ ہیں، لیکن زور بیان اور جذبے کی شدت، نے اس ذاتی غم میں بھی اجتماعی احساس پیدا کر دیا ہے۔ ان میں بلا کی کیفیت اور اثر آفرینی ہے۔ انھیں پڑھیے، آپ کو لگے گا، یادوں کی ایک برات ہے جو بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ تخاطب کا انداز، لہجے کی شدت اور رنج وغم کے فطری اثر نے ان کے مرثیوں میں بے پناہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اپنے والد کے مرثیے میں جوش نے جو چہرہ کہا، وہ شخصی مرثیہ میں چہرے کی خوبصورت مثال ہے۔ مطلع ہی درد کی ایک مخصوص فضا مرتب کر دیتا ہے۔

شیشوں میں زہر بھر دو پیر مغاں سدھارا
مے خانے بند کر دو یا ایہا السکارا

حاضر ہے جوش صبح سے مصروف سوز و ساز
قبر پدر کی دید ہے فرزند کی نماز
لیجے سلام میں ہوں وہی کشتۂ نیاز
بچپن میں آپ جس کے اٹھاتے رہیں ہیں ناز

اب وہ نگاہ لطف نہیں وہ کرم نہیں
ثابت ہوا کہ آپ کے اب کوئی ہم نہیں

جوش کی بڑی بہن افسر جہاں کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ جوش کے لئے یہ بڑا صدمہ تھا۔ ایک مرتبہ، ایک برتن جس پر مرحوم بہن کا نام کندہ تھا، دیکھ کر جوش کے جذبات بے قابو ہو گئے اور ایک درد انگیز مرثیہ سامنے آیا۔

کندہ ہے اس ظرف بشکستہ پہ یارب یہ کس کا نام
آہ اب اس نام کا مفہوم ہے زیر مزار
دل پھڑک جاتا ہے میرا آہ اے ظرف ملول
آ کہ رکھ لوں دل میں اے میری بہن کی یادگار
وہ بہن شاداب تھے جس سے روایات قدیم
وہ بہن تابندہ تھا جس سے اب و جد کا وقار
اس کے حرفوں پر نظر پڑتے ہی اک مدت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہد طفلی کی بہار

وصف نگاری، جوش کے شخصی مرثیوں کا خوبصورت پہلو ہے۔ اس سلسلے کے اشعار میں نظموں کا تسلسل اور قصیدہ کا شکوہ نظر آتا ہے۔ ہیرو کی شخصیت کے ہر پہلو اور ہر رنگ کو وہ تمام تر خوبیوں کے ساتھ یوں ابھارتے ہوئے چلتے ہیں کہ قاری کو اس کی عظمتوں اور اس کی موت سے ہونے والے اجتماعی نقصان کا احساس ہو جائے۔ خطابت جیسا انداز یوں تو جوش کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے مگر شخصی مرثیوں میں وصف نگاری کے باب میں یہ رنگ اور چیخ نظر آتا ہے۔ بات کو ہر ذہن تک پہنچانے کے لئے جوش اپنے نکتے کو الگ الگ ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تکرار، یا دہراؤ نہیں، بلکہ یہ خیال کو اس کی تمام تر جہتوں کے ساتھ پیش کرنے کی شعوری کوشش ہے۔ یہ کوئی قادر الکلام شاعر ہی کر سکتا ہے۔ جوش کا یہ انداز ان کے کلام میں اثر آفرینی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا قلم ہیرو کا ایک ایسا جادوی خاکہ کھینچ دیتا ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔
گاندھی جی کے مرثیے کے یہ بند دیکھئے۔

السلام اے سینہ اقوام کے درد نہاں
السلام اے مرحم زخم دل ہندوستاں
السلام اے دوست گیروچارہ ساز بیکساں
السلام اے آہ سرد و تیرہ بخشان جہاں

السلام اے اشک گرم سینہ چاکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

تو امین رحمت آئینہ و ایثار تھا
صحت افکار انساں کے لئے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرماشیخ کا غم خوار تھا
تو رواداری کا دیوتاامن کا اوتار تھا

السلام اے کعبہ وکاشی کے درباں اسلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں اسلام

مولانا محمد علی جوہر کے مرثیہ میں بھی، جوش نے وصف نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ مرثیہ لفظوں کی خوبصورت تصویر ہے۔ ایک ایسی تصویر، جس میں رنگ بھی ہے اور وسعت بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے متاع بردۂ ہندوستان و ایشیا
اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
اے غرور ملک و ملت تو وہاں لیتا تھا سانس
موت جس منزل پر بنتی ہے حیات پائیدار
تجھ کو بخشی تھی مشیت نے اک ایسی زندگی
جس بہادر زندگی پر موت کو آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ بر اندام تھی روح فرنگ
اے دل ہندوستاں کے عزم تند و استوار

موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
اہل بدعت کی کلائی، خنجر باطل کی دھار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے
تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو
اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، سلطاں شعار
قوم کو بخشا ہے تیری موت نے وہ بانکپن
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہ افتخار

یا راشدالخیری کے مرثیہ کے یہ شعر دیکھئے، یہاں بھی جوش نے وصف کے زندہ پیکر تراشے ہیں۔

وہ کہ جس کے دل کے اندر بے کسوں کا درد تھا
وہ کہ علم و فن بے ہمتا کے ادب میں فرد تھا
وہ کہ جس کی عقل کا سینہ تھا غم سے داغ داغ
دل تو دل، دل کی طرح بس کا دھڑکتا تھا دماغ

جوش نے شخصی مرثیوں میں، بین کی شعوری کوشش نہیں کی ہے، لیکن جذبات کے پچ سے بعض مقام پر درد و غم کی وہ مخصوص فضا قائم ہو جاتی ہے، جو مرثیہ کا تقاضا ہے۔ والد، بہن اور دوستوں کے مرثیوں میں، جذباتیت کی یہ لے اور تیز ہے۔ زبان و بیان کی ندرت اور اظہار کی برجستگی اس میں مزید درد گھول دیتی ہے۔

میرے ندیم طیّب و طاہر کو کیا ہوا
اے دوستو بتاؤ، جواہر کو کیا ہوا

ذرے سیاہ پوش ہیں، تارے ہیں سوگوار
دل کے نگر میں اب نہ کبھی آئے گی بہار
تجھ ہم نوا کی موت سے اے یار مہر کار
میں اپنی زندگی سے نہایت ہوں شرمسار

دنیائے عاشقی کی یہی رسم و راہ ہے
لیلی کے بعد قیس کا جینا گناہ ہے

گاندھی جی کی موت سے ہونے والے قومی نقصان کے ذکر سے اس بند میں بھی درد و غم کی ایک مدھم لے سنائی دیتی ہے۔

بار احساس یتیمی سے ہر اک دل ہے اداس
رہروی کے ولولے گم، روئے منزل ہے اداس
کون یہ مقتول اعظم ہے کہ قاتل ہے اداس
صدر محفل اٹھ گیا، محفل کی محفل ہے اداس

اے ابوالہند، اے خدیو کشور جاں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

اپنے دوست سردار روپ سنگھ کے مرثیہ میں، درد و غم کی یہی لے اور بے پناہ کیفیت ہے۔ اس مرثیہ کے ساتھ جوش کا یہ نوٹ بھی لگا ہے کہ 'یہ نظم جذبہء غم کی انتہائی شدت میں کہی گئی ہے، ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ۔ اے قافلے والو کی ٹیپ نے اس میں نوحے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

گونجی ہوئی آفاق میں آواز فغاں ہے
یوں ماتم سر حلقہء مندان جہاں ہے
ہر آنکھ سوئے مرگ بہ حسرت نگراں ہے
اللہ بتاؤ تو مرا روپ کہاں ہے
جس سمت ہے وہ مجھ کو بھی اس سمت بلا لو۔ اے قافلے والو

کہتے ہیں مرا روپ گیا دور بہت دور
رہتا تھا جو آنکھوں میں ہوا خاک میں مستور
بیزار ہوں جینے سے مجھے موت ہے منظور
امداد کی دو بھیک کہ ہوں بندہء مجبور
اک بندہء بے کار کے ارمان نکالو۔ اے قافلے والو

حکیم صاحب عالم بھی جوش کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔یادوں کی برات میں جوش نے بڑی محبت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ان اشعار میں بھی ،درد وغم کی فضا ہے،مگر شاعر کے انتہائے غم نے شکوے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

مورخ تھے جو میری زندگی کے
انھیں یاروں کو چن چن کے اٹھایا
مجھے اندھا بنا دینے کی خاطر
چراغ صاحب عالم بجھایا
جو اپنی ذات سے اک انجمن تھا
فلک نے خاک میں اس کو ملایا
مری خاطر جو مسجد سے نکل کر
خرابات جہاں میں چہچہایا
ستم گر زندگی تو نے بالآخر
مجھے اس کے جنازے کو دکھایا
اداسی پر مری دشمن بھی تڑپے
مشیت کو ترس لیکن نہ آیا

البتہ،مرزا احسن شر لکھنوی کے مرثیہ میں جوش نے بین کا شعوری اہتمام کیا ہے۔ہائے ہائے کی ردیف،اشعار میں اور درد گھول دیتی ہے۔

لکھنوء کی وہ بہار غنچہ بر کف وائے غم
آگرے کی وہ نسیم گلبداماں ہائے ہائے
میرے جاں پرور رفیق غنچہ و گل آہ آہ
میرے دیرینہ انیس باد و باراں ہائے ہائے
کیوں دعا میری نہ پہنچی آہ تا باب قبول
مجھ کو تجھ سے کم نہ تھا مرنے کا ارماں ہائے ہائے

یا راشد الخیری کے مرثیہ کا یہ شعر دیکھیے، آپ کو درد تصویر نظر آئے گی۔

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو اٹھ گئی
دہر سے وہ کیا اٹھا، دہلی سے اردو اٹھ گئی

ان اشعار میں رنج وغم کی تمام خاموش لہریں ہیں۔ جذبات کے انگنت دھارے ہیں، جو قاری کو بھی اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں اور وہ جانے انجانے شاعر کے دکھ میں شریک ہو جاتا ہے۔ جوش کے مرثیوں میں منظر کشی کے خوبصورت مرقعے بھی نظر آتے ہیں۔ جوش نے لفظوں کے انتخاب اور اپنے مخصوص برتاؤ سے ایسے شعری آئینے بنا دیے ہیں، جن میں منظر اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

جمنا کی سمت آہ ترا آخری سفر
اس درجہ تھا ہجوم کہ لرزاں تھی رہگزر
جلتے ہوئے جو دل تھے تو پھنکتے ہوئے جگر
پروانے کا جنازہ ہے شمعوں کے دوش پر
گلشن تھا آندھیوں کا تسلسل لئے ہوئے
گل سرنگوں تھے، میت بلبل لئے ہوئے

(مرثیہ نہرو)

موت کے باب میں، یہ شاعری جوش کی عظمتوں کی دلیل ہے۔ شخصی مرثیوں میں بھی انھوں نے بڑا دلکش شعری نظام ترتیب دیا ہے۔ خوبصورت زبان پر تشبیہ اور استعاروں کے گل بوٹے ٹانک کر انھوں نے ان اشعار میں اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ چھیتے یار کو چاند تو بہت سے لوگوں نے کہا ہے، لیکن اس کی موت کی خبر سے بے ساختہ نکل پڑنے والے آنسوؤں کو اس نظر سے جوش ہی دیکھ سکتے تھے۔

تاریک ہے نگاہ میں دنیا ترے بغیر
بھارت ہے ایک یاس کا پتلا ترے بغیر
دہلی کے حسن پر ہے رنڈاپا ترے بغیر

جمنا ترے بغیر، نہ گنگا ترے بغیر

تو گم ہوا تو اشک ہمارے نکل پڑے

جب چاند چھپ گیا تو ستارے نکل پڑے

(مرثیہ نہرو)

یہ مرثیے درد کے اس سفر سے عبارت ہیں جس سے شاعر گزرا ہے۔ احساس کا یہ سفر، ان مرثیوں میں درد اور اثر پیدا کر دیتا ہے۔ جوش نے شخصی مرثیہ کی شعریات میں نئے رنگ گھولے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں، بلا شبہ شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو طاقت دیتی ہیں۔ اسے آگے بڑھاتی ہیں۔ ان میں شعریات اور متخیلہ کے وہی رنگ ہیں جو جوش کی شناخت ہیں۔ ان میں فکر وفن کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان مرثیوں کا اپنا فکری پس منظر بھی ہے۔ یہ لَے کہیں ظاہر ہوتی ہے، تو کہیں بین السطور چھپی ہوئی ہے۔ محمد علی جوہر کے مرثیہ میں جد جہد آزادی، گاندھی جی کے مرثیہ میں فرقہ وارنہ میل جول پر خطرہ، نہرو کے مرثیہ میں جدید ہندوستان کی تعمیر و تشکیل پر برے اثر کا اندیشہ اور حکیم صاحب عالم کے مرثیہ میں اپنی ناکامی اور ٹھگے جانے کا احساس، سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی چیزیں جوش کو ہم عصر شخصی مرثیہ گو شاعروں میں الگ مقام دیتی ہیں۔ ☆☆

نظم - ۱

تو اگر واپس نہ آتی

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

ہاتھ آ جاتا اگر تیرا نہ میرے ہاتھ میں
دل میں کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں

اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تندِ باراں، وہ خروشِ برق و رعد

دفعتاً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا

وہ اپالو کے کلیجے کو مسلتی مان سون
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنون

اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا یکبارگی

تو اگر واپس نہ آتی بحر ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

اس دل سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے

موت، اور پھر موت تیری، الحفیظ و الاماں!
ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں

لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن وحیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات

پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تو اور میں، اور بحر وباراں کا خروش

اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا

جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کو کتے
نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے

رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم باہیں گلے میں ڈال کر

کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھو میں مچاتے ہم بھری برسات میں

چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر ہلکی سی دو پرچھائیاں

زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حسن وعشق کے تاروں میں ہم

وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لیے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لیے

=============

تجزیہ از میراجی

اس نظم کی کیفیت ایک تیرہ وتار خلا کی سی ہے۔ یہ خلا ہماری نظروں کے سامنے نہیں، ہمارے قدموں کے نیچے ہے۔ اس خلا کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ مفہوم کا اجالا دکھائی دینے کو ہے، اور پھر جوں جوں ہم مصرعوں کے زینے طے کرتے ہیں اور قصے کی گہرائی میں اترتے جاتے ہیں، مفہوم کا وہ چمکتا جوہر جو تہہ میں نہایت باقاعدگی کے ہ رکھا ہوا ہے، ہمیں پہلے جھلملاتا اور پھر جگمگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمیں زینوں کا احساس نہیں رہتا، یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم فضا میں معلق ہیں اور نیچے گرتے چلے جارہے ہیں۔ بلند و پست کا احساس ہے نہ گرد و پیش کا۔ خون کا دباؤ بڑھتا جارہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ متضاد کیفیت بھی قائم ہے کہ ہر سمت کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس نظم کے الفاظ سے مفہوم تک پہنچنے کی کیفیت اس ہواباز کے احساس سے ملتی جلتی ہے جو رات کے اندھیرے میں اپنے طیارے کو کسی ہوائی اڈے کے میدان میں اتار رہا ہو۔ اسی کی طرح زمین پر پہنچ کر آس پاس کے جزئیات سے قصہ بنتا ہے۔ قصہ یوں ہے:

شاعر ساحلِ سمندر پر ایک عورت کو ڈوبنے سے بچا لیتا ہے، لیکن اس مختصری بات سے بھی کئی باتیں نکلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اسی کا تعین کیجیے کہ شاعر کون ہے، وہ عورت کون ہے؟

کئی مفروضے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ ساحل پر ایک شاعر، اس نظم کا شاعر، بیٹھا ہوا ہے۔ اچانک وہ سنتا ہے کہ نہاتے ہوئے کوئی عورت ڈوب گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ یا وہ سنتا ہے کہ کسی عورت نے خودکشی کے ارادے سے اپنے جسم کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا، لیکن بچالی گئی، شاعر کو اس خبر سے تحریک شعری ہوتی ہے۔ یا شاعر بھی ساحل پر نہانے والوں میں سے ایک تھا۔ نہاتے ہوئے اچانک اس کے ہاتھ میں کسی عورت کا ہاتھ آگیا اور اسے صرف یہ خیال آیا، شاید کوئی لہر اس کے ہاتھ سے یوں چھوگئی گویا کسی ڈوبتی ہوئی عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ تحریکِ شعری کی صورت تو اوپر کے مختلف نقشوں میں سے معین کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارا استفسار ابھی تک قائم ہے۔ شاعر کون ہے، وہ عورت کون ہے؟۔ شاعر ایک عاشق ہے اور وہ عورت اس کی محبوبہ۔ اب ایک اور ہی رنگ میں قصہ قائم ہو جاتا ہے۔ شاعر اور اس کی محبوبہ اپالو کے ساحل پر بیٹھے ہیں۔ ہوا تند و تیز ہے، خروشِ برق و رعد ہے۔ بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ سمندر کے تھپیڑے ایک

وحشیانہ انداز میں ساحل سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس ہیبت ناک ماحول میں یہ دونوں ساحل پر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ نہ جانے کس طرح، مشکل سے یکجائی کا یہ لمحہ حاصل ہوا ہے۔ ''اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں''۔ ابھی اتصالِ روح نہیں ہونے پایا۔ ''آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں''۔ کوئی غم انھیں لاحق ہے، مستقل طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکنے کا غم۔ تیسرے بند میں ''سیر کرتے'' اور ''دھومیں مچاتے'' وغیرہ بھی دبی ہوئی خواہشات کی صورت میں اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ اس جوڑے کو مکمل ملاپ حاصل نہیں ہے۔ شاید عورت زندگی کی اس ناسازگاری سے زیادہ برگشتہ خاطر ہے۔ وہ مکمل ملاپ سے ناامید ہو کر، موقعے سے اثر لیتے ہوئے، طوفان ابر و باد کے جوش و خروش اور تندی و تیزی سے کمتری محسوس کر کے، اچانک سمندر میں کود پڑتی ہے۔ گھٹا گرج اٹھتی ہے، اور اس گرج کے ساتھ ہی شاعر بھی اپنی محبوبہ کو بچانے کے لیے اس کے پیچھے کود پڑتا ہے۔ اچانک بجلی چمکتی ہے، اور اس ''روشنی کے سلسلے میں'' محبوبہ کا ہاتھ شاعر کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور وہ اسے ڈوبنے سے بچا کر کنارے لے آتا ہے۔ اب اسے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ ابھی اس کے اعصاب اس ہنگامے، اس حادثے، اس المناک واقعے کے اثرات سے رہائی نہیں پا سکے، ڈھیلے نہیں ہوئے، کسی حد تک تنے ہوئے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اگر اپنی محبوبہ کو نہ بچا سکتا تو کیا ہوتا؟ ہونا کیا تھا، وہ بھی اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیتا، اور پھر ''اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں۔'' اور یوں مرنے کے بعد ان کی داستان ہی ساحل پر باقی رہ جاتی اور غم کے پرستار محبت کے اس افسانے کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔ اور یوں ''سرد ہو کر'' یہ دونوں عاشق ''زمانے کے لئے آگ بن جاتے۔''

لیکن کیا یہ نظم کہیں فراق کے بعد محبوبہ سے دوبارہ ملنے کا استعارہ تو نہیں ہے؟ کیا فرقت کی کیفیت ایک بحرِ ہیبت ناک کی سی نہیں ہو سکتی؟ اس صورت میں قصہ یوں ہو جائے گا کہ کچھ مدت جدا رہنے کے بعد شاعر کو اپنی محبوبہ سے ملنا میسر ہوتا ہے۔ وہ ایک تسکین کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔ اس لمحے میں اسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس نے ہیبت ناک کے قہر و غضب سے رہائی پائی ہے اور پھر اس کا تخیل باقی تمام نظم کھڑی کر دیتا ہے۔

قصے کی اشارتی کیفیتوں کا ذکر تو ہو چکا، اس کے علاوہ جس فن کارانہ بانکپن سے جوش نے اس نظم میں ہیرو کی ذہنی کیفیت کی مطابقت میں ماحول قائم کیا ہے وہ بھی لائقِ تحسین ہے۔ ذاتی طور پر

میرے ذہن میں اسے پڑھ کر ایک ویسی ہی اجاڑ، المناک اور سنجیدہ کیفیت طاری ہوگئی تھی جو مغربی ناول نویس اور شاعرہ ایمیلی برونٹے کی بعض نظموں سے پیدا ہوتی ہے اور خصوصاً اس کے مشہور ناول ''وڈرنگ ہائٹس'' کے جذبۂ محبت کا گھنا، گرم جادو اس تاثر سے بہت ہی ملتا جلتا ہے۔

☆☆☆

نظم - ۲

فاختہ کی آواز

آج تو فاختہ کی نرم آواز
ہے کچھ اس طرح غرق سوز و گداز
جیسے پیری میں یاد طفلی آئے
جیسے جل جل کے شمع بجھ بجھ جائے
جیسے یعقوب غرق شیون میں
جیسے سیتا کی جستجو بن میں
شب کو جس طرح دل میں درد اُٹھے
بیوگی نو عروس کی جیسے
شام کو زیر سایۂ کہسار
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار
جیسے جو بر نہ آئی وہ مراد
جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
جیسے سسرال میں کوئی لڑکی
دیکھ کر بدلیوں کو ساون میں
صبح پنگھٹ کی نیم کے نیچے
مائکے کی گھٹائیں یاد کرے

تجزیہ از صالحہ زرّیں

عام طور پر جوشؔ کی شاعری پر یہ الزام لگتا ہے کہ ان کے یہاں طول بیانی اور الفاظ کی کثرت ہے۔ یہ بات اگر چہ غلط نہیں ہے کیونکہ ان کی زیادہ تر نظموں میں طوالت اور الفاظ کی کثرت بہر حال مانی جاتی ہے اور کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر ایک ہی منظر یا جذبہ و کیفیت کو مختلف انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ جوشؔ کی شاعری کا یہ رُخ اگر چہ برا ہے لیکن اکہرا ہے۔

ان کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو اپنے اختصار، جامعیت اور پراسرار کیفیت کے لئے جانی جاتی ہیں۔ جن میں قلت لفظی یا الفاظ کی غیر معمولی دروبست تخلیقیت کا شاہکار بن گئی ہے۔ان کی ایسی ہی چند نظموں میں ایک نظم ہے ''فاختہ کی آواز'' جو محض نو اشعار پر مشتمل ایک مختصر سی نظم ہے۔ جس کے ذریعہ ایسے الزامات کی نفی بھی ہوتی ہے۔ نیز یہ نظم قدیمی وایرانی استعارات سے الگ ہٹ کر لکھی گئی ہے کیونکہ اس میں محبوب کے لب و رخسار ہیں نہ گل و بلبل کا تذکرہ ہے۔ بلکہ خالص ہندوستانی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی کیفیت کی شاعری لگتی ہے۔ حالانکہ جوشؔ فارسی شعروادب کے دل دادہ تھے اور ان کی شاعری میں تشبیہات واستعارات کی بہتات بھی رہتی ہے۔ مگر یہ نظم اس کے برعکس ہے۔اس چھوٹی سی نظم میں جو خالصتاً ہندوستانی ماحول میں لکھی گئی ہے یہاں تک کہ جس پرندہ کی آواز کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ''فاختہ'' ہے اور جو ہندوستانی ہے وہ اس پرندہ کی آواز سے جذباتی فکر کے تحت حسی اور بصری دونوں قوت سے کام لیتے ہیں۔اور اس پرندہ کی آواز میں جذباتیت اور کیفیات کا ملا جلا روپ نظر آتا ہے۔آیئے اب ذرا نظم کے پہلے شعر کو دیکھیں۔

آج تو فاختہ کی نرم آواز
ہے کچھ اس طرح غرق سوز و گداز

یعنی فاختہ کی نرم آواز شاعر کو کچھ اس طرح محسوس ہو رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سوز و گداز بھی اس کی آواز میں ڈوب گیا۔اس قدر درد و کرب ہے کہ ماضی یاد آتا ہے جس سے موجودہ وقت اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

دوسرا شعر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بڑھاپے میں بچپن یاد آجائے جیسے ایک شمع ہے جو جلتی ہے اور جل جل کر بجھ جاتی ہے۔ فاختہ کی آواز کا زیر و بم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمع جلتی ہے اور اپنے آپ اس کی لو کم ہوتی ہے اور وہ بجھنے لگتی ہے بجھتی ہوئی شمع سے مشابہت ہے پیری اور شمع طفلی سے مراد لیا گیا ہے۔

تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے وہ اس طرح کہ حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کی یاد میں روتے روتے اپنی آنکھیں کھو دی تھیں یعنی قرآن کی آیت سورۃ یوسف کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسرا مصرعہ بھی رامائن کے اس پورے منظر کو کھینچ دیتا ہے جب

رام اور سیتا محل چھوڑ کر جنگل میں چودہ برس کی زندگی گزارنے گئے تھے یعنی زندگی کی جستجو سیتا تکلیفوں اور پریشانیوں میں گزارتی ہیں۔ جوش کی شاعری کی پرتیں دیکھئے کہ جس طرح وہ ایک مصرعہ میں قرآن کی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہیں دوسرے مصرعہ میں رامائن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہی ہے ہندوستانی تہذیبی شاعری جس میں دکھ، درد اور کرب صاف جھلکتا ہے اور یہی درد ان کی شاعری میں تفکر بن کر اُبھرتا ہے اور روایات و اقدار ان کی شخصیت میں جذب و پیوست معلوم ہوتے ہیں۔

چھوتھا مصرعہ دیکھئے۔ شب کو یعنی رات کو دل میں اس طرح درد اٹھتا ہے جیسے نئی نویلی کم عمر دلہن بیوہ ہو جائے۔ اس کے دل کی کیفیت کو بیان کیا ہے ایسا درد نہ کسی سے کہا جا سکتا ہے نہ کوئی اسے بانٹ سکتا ہے۔ نظم کا سوز و گداز سے پر اور غیر معمولی شعر ہے اس میں مشرق و مغرب سے پرے محض انسانی درد کو جن کیفیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ بے پناہ اثر رکھتا ہے۔

پانچواں مصرعہ دیکھئے فاختہ کی آواز ایسی ہے جیسے جو مراد پوری نہ ہو اور جیسے جو لوگ اپنوں سے بچھڑ گئے ہوں دل میں ان کی یاد اس طرح آتی ہے۔

ساتواں مصرعہ دیکھئے جیسے کوئی انسان رو رہا ہو اور آنسوؤں میں لہریں اٹھنے لگیں معلوم ہوتا ہے کہ اب سفینے میں پانی آنے لگا۔

آٹھواں اور نواں مصرع دیکھئے جیسے سسرال میں کوئی لڑکی ساون کی بدلیوں کو دیکھ کر پنگھٹ پر نیم کے نیچے اپنی مائکے کی گھٹاؤں کو یاد کرنے لگے۔

اس پوری نظم کی نہ تشریح مشکل ہے نہ ہی اشعار بلکہ اس میں صرف ہندوستانی کلچر ہندوستانی پرندہ ''فاختہ'' اور ہندوستانی سماجی تہذیبی یعنی بن، شیون، کہار، بدلی، وادی، پنگھٹ، نیم کا سایہ، مائکے، گھٹائیں یہ ایسی اصطلاحیں ہیں جو صرف ہندستانی تہذیبی پس منظر میں ہی بیان کی جا سکتی ہیں۔

اس نظم کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ جوش کی شاعری افکار و نظریات سے زیادہ حسی، بصری کیفیات اور ان کی تہذیب سے اپنا رشتہ جوڑے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دھیرے دھیرے ان کی فکری عظمت کے عناصر سامنے آنے لگتے ہیں۔ اس نظم میں جوش نے ہندوستانی

معاشرتی، سماجی اور تہذیبی شعور سے کام لیا ہے۔ یہ نظم نہ تو اشتراکی ہے، نہ احتجاجی ہے، نہ انقلابی ہے بلکہ محسوساتی ہے جو خالصتاً ہندوستان کے تہذیب، اقدار اور جمالیاتی احساس کے دائرے میں گھری ہوئی ہے۔

جوش کی یہ نظم اپنی قلت، کیفیت اور جمالیاتی حسیت کے حوالے سے غیر معمولی حسن اور تاثر رکھتی ہے اور طول بیانی کے اس الزام کو بھی ادا کرتی ہے جو اکثر جوش پر لگائے گئے ہیں جو اگرچہ غلط نہیں ہیں لیکن پورے طور پر درست بھی نہیں ہیں جس کی خوبصورت مثال یہ نظم ہے۔

☆☆☆

تبصرے-۱

جوش شناسی
مرتب: ہلال نقوی
مبصر: سید محمد عقیل

کراچی (پاکستان) سے جوش شناسی نام سے جوش کی بازیافت کی فکر میں ایک رسالہ موصول ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ فروری ۲۰۰۸ء میں جوش شناسی' کراچی سے اور جون ۲۰۰۸ء میں جوش بانی کے نام سے پروفیسر قمر رئیس، اقبال حیدر اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے الہ آباد (ہندوستان) سے جوشیات سے متعلق ایک رسالہ شائع کیا۔

'جوش شناسی' کے مدیر ڈاکٹر ہلال نقوی نے اس رسالے کو بڑے سلیقے سے مدوّن کیا ہے۔ اس میں کچھ تنقیدی مضامین بھی ہیں جیسے ''جوش کی بدقسمتی'' از قیصر تمکین، ''بقدر ذوق نگاہ'' از اقبال حیدر، ''میرے بابا'' از سراج انور، ''بابا کے شب و روز'' از تبسم اخلاق۔ یہ دونوں مضامین بے حد معلوماتی ہیں جو جوش کی خانگی زندگی پر بڑی روشنی ڈالتے ہیں۔ قیصر تمکین نے جوش پر بے حد محکم مقالہ پیش کیا ہے اور جوش کو نظر انداز کرنے کے اسباب پر بڑی تحقیقی اور تفتیشی باتیں اٹھائی ہیں۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے رسالے کے آخر میں جوش کی تخلیقات کا جو محاسبہ کیا ہے وہ جوش پر کام کرنے والوں کی بے حد مدد کرے گا۔ جوش کے شعری مجموعوں کا اس طرح کا حساب ابھی تک میرے علم میں نہیں ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ جوش کی آخری کتاب جس کا تذکرہ، ہم تقریباً ساٹھ ستر برسوں سے سنتے آرہے ہیں یعنی کہ ''حرف آخر'' وہ بھی جوش شناس، تلاش کر کے شائع کر دیتے کہ اب رفتہ رفتہ یہ خیال ذہنوں میں جاگزیں ہونے لگا ہے کہ ''حرف آخر'' بھی کہیں غالب کے ''ماہ نیم ماہ'' اور ''مہر نیم روز'' جیسی کتاب نہ ہو، جو محض جوش کا منصوبہ ہی تھا۔ اس کی وضاحت ہونی چاہیئے۔

رسالہ جوش شناسی' میں تنقیدی حصہ بہت کم ہے۔ تنقیدی حصہ بڑھانے کی فکر ہونی چاہیئے

۔جس سے جوش کی شعری اور فکری ابعاد کا مزید محاسبہ ہو سکے۔تاہم ''جوش شناسی'' کوڈاکٹر ہلال نقوی کا ایک بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے جس کے لئے انھیں مبارک باد۔☆☆

کلیات مراثی جوش ملیح آبادی

مرتب:عصمت ملیح آبادی

مبصر:فخر الکریم صدیقی

جوش کی شخصیت اور شاعری چاہے جتنی متنازعہ فیہ رہی ہو لیکن بلاشبہ جدید مرثیہ نگاری میں انہیں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جوش نے مرثیہ کا جو نیا انداز اختیار کیا اس کے موجد و بانی وہ خود ہی تھے۔اس میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کو مقامیت و محدود حسینیت اور روایتی مرثیہ گوئی سے نکال کر احتجاج کی عالمی اور آفاقی صورتوں سے روشناس کرایا۔ان کا پہلا مرثیہ'' آوازۂ حق'' ہے جس میں جلیان والے باغ کے حادثے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔پھر ''حسین اور انقلاب'' شائع ہوا۔ان کے پہلے چند نظمیں ''سوگواران حسین سے خطاب''،''ذاکر سے خطاب'' اور ''متوالیان وقف حسین آباد سے خطاب'' لکھیں۔جن کا رد عمل بڑی خاموشی سے ذاکرین اہل بیت پر ہوا اور ان کی ان تحریروں کو مسدس کہہ کر تحقیر کا ایک پہلو نکالا گیا۔ایسے میں 'حسین اور انقلاب' کو کیوں تسلیم کیا جاتا جو مرثیوں کے تسلیم شدہ فارم میں نہ تھا۔جوش کے مرثیے مصائب کے بیان پر کم ہمت اور جوانمردی سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ آمادہ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے واقعات کربلا کے تمثیلی اشاروں کو شامل کر کے اپنے عہد کی سامراجیت کو یزیدیت اور شمریت سے تعبیر کیا۔

کلیات جوش ملیح آبادی سے پہلے پاکستان میں ضمیر اختر نقوی نے جوش ملیح آبادی کے مرثیے کے عنوان سے ایک کتاب کی تدوین کر کے ایک اہم خدمت انجام دی اور مراثی جوش کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔عصمت ملیح آبادی نے کلیات جوش میں آٹھ مرثیے ایک سلام اور تین نظمیں شامل کی ہیں۔مرثیوں کے ساتھ نظموں کی شمولیت کا جواز پیش کرتے ہوئے عصمت ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''جوش کی فکر اور ان کے موقف کو اجاگر اور واضح کرنے کے لئے میں نے کلیات میں ''ذاکر سے خطاب'' اور ''متولیان وقف حسین آباد سے خطاب'' جیسی نظمیں بھی شامل کر دی ہیں''

ص۔ ۲۷۔ کلیات مراثی جوش ملیح آبادی

'ابتدا میں ایک تفصیلی مقدمہ بہ عنوان ''شاعری میں مرثیہ کی اہمیت'' سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اس میں عرب میں مرثیے کی ارتقا (دور جاہلیت اور عہد رسالت) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور پھر فارسی سے ہوتے ہوئے اردو میں مرثیہ گوئی کی روایت کا ذکر ہے جو دکن سے دلی اور پھر لکھنؤ پہنچ کر انیس اور دبیر کے ہاتھوں عروج پر پہنچی اور توانا صنف ادب کے طور پر ابھر کر سامنے آئی .... یہاں تک کہ ''مرگ حیات کائنات کے تمام مسائل کو مرثیے نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔''

کلیات مراثی جوش ص۔ ۲۳

جوش کی مرثیہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے عصمت ملیح آبادی لکھتے ہیں

''جوش کردار حسین اور کربلا کے واقعات سے انیس اور دبیر سے بالکل مختلف معانی و مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔ یزیدی قوتوں کے خلاف حسین کی خدائی آواز ان کے لئے بشارت ہے جسے بیان کرنے میں وہ کہیں بھی نرم گفتاری سے کام نہیں لیتے ۔۔۔ جوش نے حسین کو منارۂ اسلام کی طرح قبول کیا ہے اور اس منارے کی بلندی کو وہ تا ابد قائم رکھنا چاہتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں حسین کے عزم اور قربانی صداقت اور شجاعت سے سبق حاصل کرتی رہیں''

ایضاً ص۔ ۲۵۔ ۲۴

پورے مقدمے کے مطالعے کے بعد یہ بات ابھر کر سامنے آئی ہے کہ جوش کے مرثیے نہ کسی مذہب کی تبلیغ ہیں اور نہ ہی ثواب اخروی کی تلاش بلکہ ان میں جہد انسانی کے تاریخی اتار چڑھاؤ اور زندگی کی

ارتقائی صورتوں کو سمیٹ لیا گیا ہے پتہ نہیں انھوں نے کیوں اردو زبان کے ان لسانی پیچ وخم کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے اردو نے ارتقائی منزلیں طے کیں۔ میرے خیال میں یہاں اس بحث کو شامل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی پھر بھی ان کی یہ کاوش بہ نظر تحسین دیکھی جائیگی کیونکہ انہوں نے بڑی دقت نظر، لگن اور محنت سے صحت متن کے ساتھ جوش کی رثائی شاعری کو یکجا کر دیا ہے جو مستقبل میں جوشیات پر تحقیق کرنے والوں اور عام قارئین کے لیے کارآمد ہوگی جس کے لئے عصمت ملیح آبادی کو مبارکباد☆☆

''اس وقت آپ کی (جوش) طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک ازلی پرتو پڑ رہا ہے۔ جس کے لئے صرف شعر ہی کافی نہیں ہے۔ آپ کو اپنی قدر کرنی چاہئے آپ بہت کچھ ہو سکتے ہیں، علم باطن حاصل کیجئے۔۔۔ یہ پرجوش طبیعت ہونہار ہے۔ نثر میں ندرتِ تشبیہات سے آپ کے ذہن کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ کاش کسی وقت میں آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔ آپ کی صحبت روحانی غذا ہے۔ عبرت، معرفت، بے خودی جوشِ روحانی سے آپ کے اشعار لبریز ہوتے ہیں۔ آپ نے چشم بددور، عمدہ طرز بیان پایا ہے۔ مجھے آپ سے روحانی محبت ہے آپ کے تصور سے دل کو فرحت ہوتی ہے۔ خدا آپ کو زندہ اور برہم معنی کو آپ کی ذات سے روشن رکھے۔''

اکبر الہ آبادی

از روح ادب (۱۹۲۰)

تبصرے - ۲

چند نئی کتابیں - تعارف و تبصرہ

وحید العصر، وحید الہ آبادی

مصنف: محمد واصل عثمانی (حال مقیم امریکہ)

مبصر: سید محمد عقیل

وحید الدین وحید اصلاً پرگنہ کڑا، ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ الہ آباد ہی میں گزرا۔ وہ اردو کے مشہور طنزیہ اور مزاحیہ شاعر، اکبر الہ آبادی کے اُستاد تھے۔ اور اردو کے حلقے میں اپنے دو اشعار سے اپنی پہچان بنائے ہوئے ہیں

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا

دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

=====

محبت بھی ہوا کرتی ہے، دل سے دل بھی ملتا ہے

یہ سب ہوتا ہے لیکن آدمی مشکل سے ملتا ہے

کبھی کبھی وحید کا ایک اور شعر بھی پڑھا جاتا ہے۔

دو ہی گھڑیاں سخت گزریں مجھ پہ ساری عمر میں

اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد

کہیں یہ بھی پڑھا کہ یہ شعر بھی وحید الہ آبادی کا ہے۔

کچھ کہہ کے اُس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یہ وہ اشعار ہیں جو اکثر اردو کی صحبتوں میں آج بھی پڑھے جاتے ہیں، اگر چہ لوگ شاعر کا نام نہیں

جانتے۔

واصل عثمانی نے اپنی اس کتاب میں وحید الہ آبادی کے سلسلے میں جو کچھ بھی انھیں ملا سب اکٹھا کر دیا ہے۔ اگر چہ انھوں نے خود با قاعدہ کوئی تحقیقی مقالہ خود نہیں لکھا مگر وحید پر آئندہ کام کرنے والوں کے لئے بڑی دلچسپ اور اہم بحثیں اٹھائی ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ اسلم فرخی صاحب نے لکھا ہے۔ وحید کے سلسلے میں بہت سے اختلافات بھی اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔ بعد ان کے جوابات بھی جو اردو کے محققین اور اہل ادب دیتے رہے ہیں سب اس کتاب میں درج ہیں۔ وحیدؔ کی ولادت، ان کا اصل استاد کون تھا، بشیرؔ یا آتشؔ، خود وحیدؔ کا اصل نام کیا تھا، وہ مصحفیؔ کے دور میں تھے یا نہیں وغیرہ بہت دلچسپ بحثیں ہیں۔ وحیدؔ کے والد، تذکرۂ شعرائے الہ آباد کے مصنف، امر اللہ الہ آبادی، ان کا استاد کون تھا۔ اس وقت الہ آباد میں شعر و شاعری کی کیا صورت تھی۔ یہ تمام بحثیں تحقیقی شواہد کے ساتھ ہیں۔ سب سے دلچسپ بحث وحیدؔ کے اپنے دیوان کی ہے جو آج تک شٹل کاک کی طرح دست بدست گھومتا پھر رہا ہے مگر نہ پاکستان میں اس دیوان کو کسی ادارے نے شائع کیا اور نہ ہندوستان میں۔ یہ وہی دیوان ہے جسے نذرِ آتش ہونے سے بچانے کے لئے خود وحیدؔ نذرِ آتش ہو گئے۔ اس کتاب میں یہ واقعہ بھی تفصیل سے مختلف راویوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ دیوان کراچی میں وحیدؔ کے اعزا کے پاس آج بھی موجود بتایا جاتا ہے۔ دیوان کو بچانے کے بعد خود جل کر مر جانے کا یہی واقعہ من و عن مشہور مرثیہ نگار میر ہادی وحیدؔ جو غالباً انیسؔ کے بھتیجے تھے ان کا بھی بتایا جاتا ہے اور محققینِ مرثیہ گویانِ لکھنؤ میں مشہور ہے۔ کہ میر وحیدؔ بھی اپنا مرثیوں کا بستہ بچانے میں بالکل اسی طرح جل کر مرے تھے جیسا کہ وحیدؔ الہ آبادی کا واقعہ ہے۔ یہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے نیز واقعات کا پھیر بدل (Over laping) بھی کیوں کہ دونوں وحیدؔ کا دورِ حیات بھی تقریباً ایک ہی ہے۔ بابائے اردو عبد الحق نے جب وہ ہندوستان میں تھے تو انھوں نے علی حسنین زیباؔ ردولوی سے کہہ کر وحیدؔ الہ آبادی کے دیوان کا ایک انتخاب ضرور شائع کیا تھا مگر یہ بھی اب نایاب ہے۔ اس کتاب میں وحیدؔ کا ایک شعر

اب تم وحیدؔ واقف کس رنگ سے نہیں ہو

فیض بشیرؔ سے یاں کہیئے تو کیا نہیں ہے

پیش کر کے یہ طے کر دیا گیا ہے کہ وحیدؔ اصلاً بشیرؔ ہی کے شاگرد تھے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ دانا پوری کا ایک ایسا مضمون بھی درج ہے جس میں وحیدؔ الہ آبادی کو آتشؔ کا شاگرد ثابت کیا گیا ہے۔ یہ وہی طلحہ رضوی برقؔ ہیں جنھوں نیا پنی کتاب 'نقد و بخش' میں صفحہ ۱۳۲ پر لکھا ہے کہ اکبر الہ آبادی کا اصل وطن الہ آباد نہیں بلکہ داؤ دنگر ضلع گیا (بہار) تھا۔ چلئے الہ آباد کا ایک بڑا شاعر تھا، وہ بھی بہار پہنچ گیا۔

بہر حال یہ کتاب ''وحید العصر، وحید الہ آبادی'' سرسری کتاب نہیں بلکہ تحقیق کی دنیا میں اس سے بہت نئے دروازے بھی تحقیق کے لئے کھلتے ہیں۔ اس کی قیمت مبلغ دو سو روپیہ ہے۔ ☆☆

خبر تحیّر (شاعری)
مصنف: فرید پربتی
مبصر: علی احمد فاطمی

فرید پربتی یوں تو غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے رباعیوں پر بھی بڑا کام کیا ہے۔ صنف رباعی پر تو ایک کتاب لکھی ہی ہے نیز رباعیاں بھی ہیں۔ خبر تحیر اسی مجموعہ کا نام ہے جو بے حد معنی خیز ہے کیونکہ رباعی میں فکر کی جامعیت ناگزیر ہے۔ استادانہ عمل ہے اور شاعر کے باطن کا سراغ بھی۔ یہ سب تو غزل میں بھی ہوتا ہے لیکن رباعی میں ایک مخصوص مزاج، مذاق اور تہذیب ہوتی ہے اور ایک حکیمانہ سنجیدگی بھی۔ اسی لیے اکثر شعرا اور بالخصوص نئے شعرا اس مشکل صنف کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن فرید پربتی نے پوری جرات و جسارت اور تخلیقیت کے ساتھ اس صنف پر طبع آزمائی کی اور بڑے اہتمام سے اسے پیش بھی کیا۔ ان رباعیوں میں کچھ تو رومانی نوعیت کی ہیں کچھ زمانے کے حالات پر اور کچھ فکر و فلسفہ پر۔ ایک رباعی میں وہ اپنا تعارف بھی پیش کرتے ہیں۔

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں

میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسف ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں وادیء کشمیر سے ہوں

اچھی بات یہ ہے کہ یہ رومان صرف محبوب کے حسن تک محدود نہیں رہا وہ دنیا کو بھی حسین دیکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں۔

دنیا نئے سانچے میں ڈھل جائے گی
ہاں فطرت آدم بھی سنبھل جائے گی
حالات بدل جائیں گے پھر اس کے بعد
اس ظلم کی بنیاد بدل جائے گی

اس مجموعہ کی اشاعت پر فرید پربتی مبارک باد کے مستحق ہیں۔☆☆

منتشر لمحوں کا نور (شاعری)

مصنف: کبیر اجمل

مبصر: خواجہ جاوید اختر

کبیر اجمل نوجوان شاعر ہیں اور ''منتشر لمحوں کا نور'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو بے حد اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ بنیادی طور پر غزلیں ہیں اور ان پر دو نقادوں کے مضامین ہیں ہر چند کہ ان مضامین کی سفارش کے بغیر بھی یہ غزلیں وہی آب و تاب رکھتی ہیں جو انھیں رکھنا چاہیئے۔ بنارس کے اس شاعر کے یہاں غزلوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہونا چاہئے لیکن وہ سب کچھ غزلوں میں سمٹ آیا ہے۔ بعض اشعار ایسے ہیں جو روایتی سے لگتے ضرور ہیں لیکن ان میں پیش کش کی جو سادگی ہے وہ دامن دل کھینچتی ہے مثلاً

تعلق بے زمیں رہنے دیا ہے
جہاں کا تھا وہیں رہنے دیا ہے

جب کبھی نوک قلم آگ اگلنا چاہے
اک سمندر میری تحریر میں ڈھلنا چاہے

جس شاعر کے یہاں آگ اور سمندر جیسا جذبہ ہو اس کی پذیرائی ضروری ہے اس کی آواز تنہا اس کی آواز نہیں ہو سکتی وہ زمانے کی آواز بن کر رہے گی۔ پھر یہ شعر دیکھئے۔

جب بھی بول اٹھیں گے تنہائی میں لکھے ہوئے حرف
پھیلتے جائیں گے ناقوس و اذاں سے آگے

ناقوس واذاں کا یہ انجذاب بنارس کے شاعر کے یہاں ہی مل سکتا ہے۔ غالب نے بنارس کو یونہی پسند نہیں کیا تھا۔ اجمل کے لہجہ میں تازگی ہے اور سنجیدگی بھی۔ آگ اور سمندر کے رشتوں میں کوئی بھٹکاؤ نہ آیا تو یہ شاعری آگے چل کر یقیناً کوئی نئی اور اہم شکل اختیار کرے گی۔☆☆

پرورش لوح وقلم

مصنف: راشد انور راشد
مبصر: فخر الکریم صدیقی

راشد انور راشد دور حاضر کے بلکہ نئی نسل کے ان ذہین طباع اور فعال شاعروں میں سے ہیں جو صرف شاعر نہیں ہیں بلکہ نقاد بھی ہیں۔ اصلاً بہار کے ہیں لیکن دہلی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ملازم ہوئے جمشید پور کے مشہور کالج میں لکچرار ہوئے اور اب علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہء اردو میں استاد ہیں اور پڑھتے لکھتے رہتے ہیں۔ مختلف مقامات پر آہ وفغاں سے گزرنے کے بعد اب انہیں علی گڑھ ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی علی گڑھ کی خوشگوار ادبی فضا کے نام معنون ہے۔ اور ہونا بھی چاہیے کہ اس کی اشاعت کا بندوبست بھی شعبہء اردو علی گڑھ یونیورسٹی نے ہی کیا ہے۔ اس کتاب میں نقطۂ نچہ ہائے نظر اور فن اور فنکار کے عنوان کے تحت ۲۴ مضامین شامل ہیں۔ جس میں شاعری تنقید فکشن ڈراما بھی کچھ شامل ہیں۔ علی گڑھ کے آل احمد سرور تو ہیں ہی مختار الدین احمد شہریار سے لے کر اسعد بدایونی تک شامل ہیں۔ ایک مضمون تو علی گڑھ کے ترقی پسند نظم گو شعراء پر بھی ہے۔ مضامین

چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن اپنی بات کہنے میں کامیاب ہیں۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ کتاب مصنف کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے اور ابھی غیر مطبوعہ مضامین کی بھی خاصی تعداد ہے۔ لکھنے پڑھنے سے متعلق ان کا خیال ہے کہ۔ ''کچھ لوگوں نے بسیار گوئی کی بات کہہ کر خاکسار کے حوصلے کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا رکھا۔ غور و خوص کے بعد مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ لکھنے سے تو بہتر ہے کہ کچھ لکھا جائے۔''

جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے کہ یہ مضامین کم ہیں محض قاری کا ایک ردعمل ہے اس خاکساری نے ان کی مدد کی ہے ورنہ زیادہ تر مضامین تبصرے زیادہ ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وہ پڑھتے خوب ہیں بس پڑھنے لکھنے کے درمیان جو تناسب اور توازن ہونا چاہیئے اس پر غور کی ضرورت ہے جو شیلے، فعال نوجوان اکثر اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں بہرحال اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد ہی دی جا سکتی ہے کیونکہ بعض مضامین میں وہ واقعی عبادت گذانہ عمل سے گزرے ہیں۔ ☆☆

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا

مصنف: خلیق انجم

مبصر: حسنین اختر

خلیق انجم بنیادی طور پر محقق ہیں اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری۔ غالب کے ماہر کے طور پر بھی شہرت رکھتے ہیں۔ بزرگ ادیبوں میں ہیں ایک زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ انہیں ملاقاتوں اور یادوں کو سمیٹ کر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے جو بے حد عمدہ طور پر شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں سترہ (۱۷) بزرگ ادیبوں، شاعروں اور استادوں کے کچھ خاکے ہیں۔ کچھ تذکرے ہیں کچھ یادیں ہیں بعض بزدگوں کے سلسلے میں احترام و ادب اور محبت اور عقیدت شامل ہے مثلاً رشید احمد صدیقی، امتیاز علی خاں عرشی، نورالحسن ہاشمی، سید حامد وغیرہ کا ذکر انہیں حوالوں سے ہے۔ کچھ کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں ہے مثلاً انور صابری، استاد سا دہلوی وغیرہ۔ علی جواد زیدی، جمیل جالبی اور مشفق خواجہ وغیرہ تیسری صف میں آتے ہیں۔ بہرحال ان سب

کے اذکار اور حالات سے پرانی تہذیب اور خصوصاً دہلوی تہذیب کا جس قدر اندازہ ہوتا ہے وہ نئی نسل کے لیے ایک خزانہ ہے۔ بعض ادیبوں کی ادبی وابستگی اور والہانہ سپردگی کا بھی جس طرح سے ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ایک سبق ہے نئی نسل کے لئے۔ کہ علم کو عبادت کی طرح سے کیسے لیا جاتا ہے۔ یہ کتاب نئی نسل کے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔ اس سے ایک نئے خلیق انجم کا ظہور ہوتا ہے۔ خاکوں پر کتابیں کم ہی لکھی جاتی ہیں۔ نئے ادب میں تو یہ صنف عنقا ہے۔ ایسے میں اس کتاب کی آمد ایک خوشگوار جھونکا ہے۔ ☆☆

کارِزیاں (شاعری)
مصنف: عالم خورشید
مبصر: فخرالکریم صدیقی

عالم خورشید نئی نسل کے اہم اور ممتاز شاعر ہیں۔ کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور اپنے مخصوص لب و لہجہ سے اپنی منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔ زندگی سے براہ راست رشتہ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی پر اسراریت جو دوری اور عدم وابستگی کی وجہ سے معمہ بنی ہوتی تھی دھیرے دھیرے کھلنے لگتی ہے تبھی تو وہ کہتے ہیں۔

جب تک کھلی نہیں تھی اسرار لگ رہی تھی
یہ زندگی مجھے بھی دشوار لگ رہی تھی

اور پھر زندگی کے یہی تجربات، مشاہدات ان کے شعر و سخن کا ناگزیر حصہ بن گئے اور جسے بڑے سلیقے سے عالم خورشید نے غزل بلکہ جان غزل بنا دیا۔ یہ کام آسان نہیں اس کے لئے غور و فکر کے ساتھ ساتھ ریاضت بلکہ عبادت کا سا جذبہ چاہیئے اور ایک مثبت وصحت مند نظریہ بھی۔ عالم خورشید کا یہی وصف ہے کہ وہ سب کچھ مثبت انداز سے لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد کا آشوب ان کی تخلیقی جمالیا کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کے لیے جس وابستگی اور سپردگی کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ عالم خورشید کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جس کو بڑے سلیقہ سے عالم نے شیشۂ غزل میں اتار دیا ہے۔ عالم

خورشید نے لہجہ میں بڑی سادگی اور روانی رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں جدیدیت، تجریدیت سے عاری خواص اور عوام میں یا ساپسند کی جاتی ہیں۔ عالم خورشید نرے شاعر نہیں ہیں وہ ادب و تنقید بھی پڑھتے ہیں اور کتاب زندگی بھی۔ اسی سے ان کی شاعری میں ادب اور زندگی دونوں کا فنکارانہ امتزاج ملتا ہے۔☆☆

فلک پہلو میں (شاعری)
مصنف: خورشید اکبر
مبصر: خواجہ جاوید اختر

نئی نسل کے شاعروں میں خورشید اکبر نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں 'فلک پہلو میں' ان کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے جس میں صرف غزلیں ہیں۔اس مجموعہ کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس میں کسی ناقد یا پروفیسر کا مقدمہ نہیں ہے اس لئے اس میں کسی طرح کا مبالغہ آمیز، کزب انگیز دھوکہ نہیں ملے گا براہ راست غزلوں کا مطالعہ فکری اور تخلیقی رویوں کا ایماندارانہ نیز مفکرانہ احساس و شعور ایک نئے قسم کے ادبی و جمالیاتی حظ سے دو چار کرتا ہے۔دور حاضر کے معاملات اور مقدمات بھی ہیں مثلاً یہ مصرعے

یقیں ہے جس پہ وہی بدگماں نکلتا ہے
شہر کا شہر ہے بے زار کہاں جاؤں میں

پھر ایسے غیر معمولی تخلیقی مصرعے بھی

صحرا میں خوب نقش قدم آپ نے چنے
بے جان ہے صحرا تو اسے جان کیا جائے

اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ خورشید اکبر کے یہاں غیر ضروری نراجیت اور یاسیت نہیں ہے حالات حاضرہ کا اشارہ ہے اور امید و نشاط کا رویہ بھی۔جس سے ان کی شاعری کا ایک مخصوص خمیر تیار ہوتا ہے اور اسے لائق مطالعہ بناتا ہے۔ان کی غزلوں میں عصری حسیت، جدیدیت اور کلاسکیت نے مل جل کر

ایک ایسا آمیزہ تیار کیا ہے کہ جس کا مطالعہ ہر عہد اور ہر طبقہ کے قاری کو قرآت کے مخصوص انبساط سے دوچار کرے گا اس شعری مجموعہ کا استقبال کیا جانا چاہیئے۔☆☆

اسلامی ترقی پسندی

مصنف: علی جواد زیدی

مبصر: صالحہ زرّیں

بزرگ ادیب علی جواد زیدی صرف ایک شاعر نہ تھے بلکہ ایک عمدہ محقق مفکر اور دانشور بھی تھے انہوں نے تحقیق وتنقید کے علاوہ متعدد دانشورانہ مضامین بھی لکھے ہیں جن کا تعلق محض ادبیات سے نہ تھا بلکہ سماجیات، سیاسیات اور مذہبیات سے تھا۔ مذہبیات پر انھوں نے جو بھی لکھا اس کو ترقی پسند نقطہ نظر سے دیکھا پرکھا کیونکہ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند دانشور تھے اور مسائل کو معروضی نقطہ نظر سے جانچتے پرکھتے تھے۔ ان کے اسی نوعیت کے بکھرے ہوئے مضامین کو گذشتہ دنوں نوجوان نقاد اور ہمارے دوست الیاس شوقی نے ترتیب دیا اور 'اسلامی ترقی پسندی' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ ایک جگہ وہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کی وہ ساری خوبیاں جن سے یہ مذہب عبارت ہے خود مسلمانوں میں سے غائب ہوتی جارہی ہیں۔ علی جواد زیدی نے اس نقصان کو محسوس کیا اور اس کی تلافی کے لئے کمر بستہ ہو گئے اسلامی ترقی پسندی کا یہی جواز ہے۔ یہ ان کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو ان میں موجود اسلامی دردمندی کے ساتھ ان کی شخصیت کے عالمانہ پہلو پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔''

عمل۔ انسانی عظمت۔ عروج نسواں۔ رزق حلال۔ ذاتی پرستش۔ کبھی نہیں وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کی افادیت کل کے مقابلہ آج زیادہ ہے۔ الیاس شوقی اور زیدی مرحوم کے بیٹے انور زیدی دونوں نے مل کر یہ اچھا کام کیا ہے۔ ان مضامین اور اس کتاب کا استقبال ہونا چاہئے۔☆☆

نقد آ گہی
مصنف: فیاض رفعت
مبصر: نغمہ پروین

فیاض رفعت بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن وہ نرے شاعر نہیں ہیں علم و ادب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔نثر میں بھی لکھتے رہتے ہیں۔کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔تازہ ترین کتاب ان کے تنقیدی مبادیات،ادبی تاثرات اور متفرقات وغیرہ کا مجموعہ ہے۔مضامین میں اگر سنجیدگی ہے تو رپو رتا ژ اور خاکہ نگاری میں تخلیقی دلکشی پائی جاتی ہے۔فیاض رفت کا اسلوب سادہ اور پر کشش ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات بڑے اعتماد اور سلیقے سے کہتے ہیں۔ان کی تحریر میں ادب کی تہذیب اور وضعداری بھی جھلکتی ہیں۔جو اس دور میں ناپید ہے۔

''اردو افسانے کے ابتدائی نقوش'' ایک اچھا تحقیقی مضمون ہے اسی طرح سے فو اور حقیقت،فن اور تنقید بھی عمدہ مضامین ہیں اس کتاب کو معیار پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔☆☆

ہمارا تہذیبی وثقافتی سرمایہ
مصنف: احمد طارق
مبصر: عبدالحی

احمد طارق نوجوان ادیب ہیں ''اردو افسانے میں مشترکہ تہذیبی عناصر'' میں عمدہ کام کیا ہے اسی تہذیب کو لے کر اور پھیلا کر انہوں نے نئی کتاب لکھی ہے جو ایک کار آمد اور مفید کتاب ہے اس کتاب میں وادئ سندھ سے قبل کی تہذیب سے لے کر جدید تہذیب تک تحقیق آمیز گفتگو کی گئی ہے درمیان میں آریائی تہذیب ۔بدھ تہذیب ۔ہندو تہذیب۔جنوبی ہند کی تہذیب۔ اسلامی

تہذیب اور پھر سب سے بعد میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب پر گفتگو کی گئی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر فرقہ پرستوں کے حملے ہورہے ہیں اور ایک خاص مذہب کی تہذیب سے وابستہ کئے جانے کی ناکام اور مسموم کوشش کی جارہی ہے۔ ایسے میں اس کتاب کی آمد ایک نیک فال ہے اس کی اشاعت پر نو پر دلی مبارک باد دی جانی چاہیئے اور اس کتاب کا بھرپور استقبال ہونا چاہیئے۔☆☆

جہات حسرت

مرتب: سید جعفر احمد

مبصر: علی احمد فاطمی

ڈاکٹر سید جعفر احمد نہایت لائق اور محنتی انسان ہیں۔ پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی کے ڈائرکٹر ہیں۔ ارتقا کی ادارت سے وابستہ ہیں۔ اور بھی کئی اداروں سے وابستہ ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پاکستان میں حکومت، سیاست اور دستوری امور ان کی دلچسپی کے خصوصی موضوعات ہیں۔ کئی بڑی کتابیں لکھ چکے ہیں کئی ترتیب دے چکے ہیں۔ جہات حسرت ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے جس میں انہوں نے ہندو پاک کے بڑے بڑے ادیبوں کے منتخب مضامین شامل کئے ہیں اور حسرت کی مختلف جہات کو کور کیا ہے۔ سیاست کے موضوع پر سحر انصاری، علی احمد فاطمی اور خود جعفر احمد کے مضامین ہیں۔ ادب کے خانے میں فرمان فتح پوری، سید محمد عقیل، محمد علی صدیقی، ہلال نقوی، خالد فیاض، شفقت رضوی وغیرہ کے مضامین ہیں۔ صحافت پر طاہر مسعود، مذہب و مسلک پر معین الدین عقیل، خواجہ رضی حیدر اور شخصیت پر آغا سہیل، حکیم محمود احمد برکاتی، انوار احمد ☆، وقار احمد زبیری کے مضامین ہیں۔ ابتدا میں جعفر احمد کا لکھا ہوا ایک مختصر سا مقدمہ بھی ہے جس میں حسرت کے کارناموں اور کتاب کے اشاعتی سلسلوں پر مختصر روشنی ڈالی گئی۔ حسرت موہانی اپنی غزل گوئی کی وجہ سے ادب میں اپنا منفرد مقام ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے دوسرے گوشوں پر توجہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک طرح سے اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ مصلحت کوشی، جنگ زرگری کے اس دود میں حسرت کی ایماندارانہ اور بے باکانہ شخصیت و شاعری پر کتاب کا آنا ایک نیک فال ہے۔ اس کے

لیے جعفر احمد کو مبارک باد دی جانی چاہیے۔☆☆

جاں نثار اختر: حیات وفن

مصنفہ: کشور سلطان

مبصر: عبدالحی

ممتاز ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر اکثر نظر انداز ہوئے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ دوسرے معاصر شعراء کی تیزی وطراری اور جاں نثار اختر کی سادگی اور خاموشی لیکن اچھی شاعری خواہ کتنی خاموش اور گوشہ نشین کیوں نہ ہو اپنی خوشبو بہر حال پھیلاتی ہے۔ خاموشی کے ساتھ جاں نثار اختر نے عمدہ شاعری کی اور کچھ اچھے کام بھی کیے۔ ان سب کاموں کا مکمل احاطہ کئی برس پہلے ڈاکٹر کشور سلطان نے اپنے تحقیقی مقالہ ''جاں نثار اختر حیات وفن''میں کیا تھا۔ یہ ایک اچھا اور قابل ذکر کام تھا۔ عرصہ سے یہ مقالہ دستیاب نہ تھا لیکن اب اس کا دوسرا ایڈیشن آ گیا ہے ۴۱۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آ چکا ہے اس کی قیمت پانچ سو روپے ہے۔ اسے ہندوستان کے تمام اشاعتی اداروں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔☆☆

بہار ایجاد

مصنف: سید امین اشرف

مبصر: علی احمد فاطمی

بہار ایجاد اردو کے بزرگ پختہ شاعر سید امین اشرف کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ سید امین اشرف غزل اور تہذیب غزل سے نہ صرف معرفت رکھتے ہیں بلکہ بے پناہ تخلیقی اظہار پر قدرت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے خیالات کے ساتھ ساتھ ان کی زبان، اسلوب، بندشوں پر تو بڑے سے بڑے نقاد سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ امین اشرف کا بنیادی موضوع عشق ہے لیکن عشق کی سبک گامی زندگی کی

تلخ گامی میں تبدیل ہوکر انسانی خیر خواہی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو ان کی نظریں حیات و کائنات پر جاٹکتی ہیں ان حوالوں سے وہ تصوف کی دنیا میں بھی چلے جاتے ہیں اور درد آشنائی ایک مخصوص غزلیہ آہنگ اختیار کر لیتی ہے خود کہتے ہیں

جو نہ ہو درد آشنا، وہ سر خوشی کس کام کی
شاعری، تمثیل یا صورت گری کس کام کی

بہار ایجاد کھر دری، انتشاری شاعری کے باد سموم میں ایک لطیف و خوشگوار جھونکے کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مطالعہ عشقیہ جذبات کی انگیزی کے ساتھ ساتھ روحانی بالیدگی کا سبب بنتا ہے۔ ایسے مجموعہ کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ ۱۶۷ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔☆☆

انداز گفتگو

مصنف: عمر رضا

مبصر: عبدالندیم

انداز گفتگو ڈاکٹر محمد عمر رضا کی تنقیدی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ مجموعہ چودہ مقالات پر مشتمل ہے جن کے عناوین ہیں۔ غالب کی مصلحت پسندی، یادگار غالب اور حالی کی سوانح نگاری، مقدمہ شعر و شاعری کی تنقیدی معنویت، اقبال کا تصور وطنیت، مجاز فن شاعری کے آئینے میں، انسان دوست شاعر اور ادیب علی سردار جعفری، علی سردار جعفری اور جنگ آزادی، سردار جعفری کی شاعری، اردو غزل گوئی اور سردار جعفری، علی سردار جعفری اور گیان پیٹھ ایوارڈ، قرۃ العین حیدر کا فن، اردو شاعری میں بسنت، جدید مثنویوں کی سماجی و ثقافتی اہمیت، ہندوستان کی ثقافتی رنگا رنگی اور مولانا ابوالکلام آزاد، عمر رضا نے تمام مقالات میں معروضی نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے موضوع کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جگہ جگہ نئے نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مقالات کے مطالعہ سے مصنف کی وسعت مطالعہ اور ان کی فکری جہت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں تمام مضامین اپنی جگہ پر

اہمیت کے حامل ہیں لیکن سردار جعفری سے متعلق مضامین کافی اہم اور قابل قدر ہیں جن کے دوران مطالعہ جعفری سے مصنف کے ذہنی شغف کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ بالخصوص یہ کتاب طلبہ کے لئے بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کی پزیرائی حلقہ نقد و نظر میں ضرور کی جائے گی۔ کتاب کی قیمت سو روپیہ ہے جو کہ مناسب ہے۔☆☆

قصہ بے سمت زندگی کا

مصنف: وہاب اشرفی

مبصر: علی احمد فاطمی

'قصہ بے سمت زندگی کا' اردو کے ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کی آپ بیتی ہے جو تقریباً ۳۶۵ صفحات پر مشتمل سولہ ابواب میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائی ابواب میں یقیناً آپ بیتی کی سی کیفیت ہے لیکن جیسے جیسے سفر آگے بڑھتا ہے یادداشتوں کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ واقعات اور افراد کا ذکر زیادہ ہوتا جاتا ہے اس بھیڑ بھاڑ میں اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ مصنف کن واقعات اور افراد سے متاثر ہوا ہے اور ابتداً کس نے علم و عمل اور فکر و نظر کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ جدید ادیب ہوئے تو کیوں ہوئے اور مابعد جدید ہوئے تو کیوں؟ درمیان میں ترقی پسند بھی ہوئے اور لندن کی گولڈن جبلی کانفرنس میں بحیثیت ترقی پسند ادیب شرکت کی۔ احباب کی کثرت سے ایک عام قاری کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے ویسے کثرتِ احباب میں سے اکثر کو لوگ جانتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جنھیں جاننے کی ضرورت نہیں لیکن مصنف نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ کوئی معمولی سے معمولی ادیب یا دوست چھٹنے نہ پائے اور سب خوش رہیں۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات اچھی ہوسکتی ہے لیکن آپ بیتی کے فکر و فن کے اعتبار سے شاید اچھی نہیں۔ آپ بیتی ایک احتسابی عمل ہے جو جیل جائے بغیر بھی ہونا چاہئے یعنی احتساب اگر زندان حیات میں ہوا ہوتا تو شاید مصنف کو جیل جانے کی نوبت بھی نہ آتی۔ کتاب کے ابتدائی ابواب اور آخری ابواب متاثر کرتے ہیں درمیان میں صرف بھیڑ بھاڑ ہے جسے کم کیا جاسکتا تھا۔ ایک ذہین قاری مصنف کا ورق ناخواندہ پڑھنا چاہتا ہے جو اس کتاب میں کم پڑھنے کو

ملتا ہے تاہم ایک ذی علم دانشور کی آپ بیتی میں کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے۔اور وہ اس کتاب میں ہے اس کچھ کے لئے ضخیم کتاب پڑھنے کی سفارش کئے جانے میں کوئی حرج تو نہیں کیونکہ بقول ایک مفکر کہ اس زندگی میں جو بھی چھپی ہوئی چیز ہے وہ پڑھنے کے لئے ہے۔اس لئے اس کتاب کو بھی پڑھا جانا چاہیئے۔

اس کتاب کی قیمت ۴۰۰ روپئے ہے اسے ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے۔☆☆

جوش بانی۔ا (عالمی جریدہ)

مرتبین و مدیر: قمر رئیس، اقبال حیدر، علی احمد فاطمی

مبصر: عبدالاحد ساز

جوش ملیح آبادی اپنی عبقری اور ہمہ گیر شخصیت اور کثیر الجہات فراواں و بے پایاں شعری سرمائے کی بنا پر ہر طرح اس تفویض کے مستحق ہیں کہ انہیں ایک بڑی ادبی ہستی ہی نہیں بلکہ بجائے خود ایک شعبہء ادب قرار دیا جائے اور غالبیات اور اقبالیات کی طرح جوشیات کی اصطلاح بھی رائج کر لی جائے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوش پر ان کی زندگی میں بھی بہت کچھ لکھا گیا کئی رسالوں کے ضخیم نمبر نکلے اور کئی تحقیقی مقالے تحریر کئے گئے، لیکن پاکستان منتقل ہو جانے کے غیر دانشمندانہ اقدام کی وجہ سے سرحد کے دونوں طرف انہیں اپنی قدر و توقیر میں خاصی تخفیف کا بھی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ناقدری کی یہ طوالت ان کی اخیر عمر کی تنہائی اور کسی حد تک گوشہ نشینی کو پہنچی اور انھیں عمر کے اس مقام پر جب وہ اسلام آباد میں تقریباً نظر قید کر دئے گئے تھے اور میڈیا اور وسائل کے دروازے ان پر مقفل کر دیئے گئے تھے۔کہنا پڑا تھا کہ ''بول اے خونخوار تنہائی کسے آواز دوں!''

اب جب کہ جوش صاحب کی رحلت کو رُبع صدی کا عرصہ گذر چکا ہے ادھر چند برسوں سے ان کی بازیافت پر توجہ دی جا رہی ہے یہ تاریخ کا شاید نامعلوم پُر اسرار عمل ہے کہ وہ اپنے ہیروز کو،

اگر وہ واقعی ہیروز ہیں، ایک وقفۂ غیاب و فراموش گاری کے بعد از خود ہی نمایاں کر لیتی ہے اور ان کی تلاش کی نفسیات کئی اذہان میں کار فرما ہو جاتی ہے۔ اس کی بیّن مثال نظیرؔ اکبر آبادی ہیں۔ ان کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک ان کی شاعری کو سوقیانہ اور مبتذل کہہ کر نظر انداز کیا گیا۔ میرؔ جیسے شاعر نے اپنے تذکروں کی کتاب 'نکات الشعراء' میں نظیر کا ذکر تک نہیں کیا لیکن تاریخ نے اپنے طور پر نظیر کو محفوظ رکھا اور آج وہ عوامی شاعری کے حوالے سے اردو نظم کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ اسی طرح جوشؔ کو بھی ادھر ممکنہ پہلوؤں سے تلاشا اور کھنگالا جا رہا ہے۔ لندن اور کراچی میں جوشؔ فاؤنڈیشن کا قیام ہندو پاک اور بیرونی ممالک میں جوشؔ پر سیمنار اور چند رسائل کی جوشؔ پر تازہ اشاعتیں وغیرہ اسی توجہ کی غماز ہیں، لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ جوشؔ کے شعر و نثر کے اتنے احاطے اتنے رقبے اور اتنے گوشے ہیں کہ انہیں کسی ایک مبسوط اشاعت میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ ضرورت تھی ایک متواتر کتابی سلسلے کی جو جوشؔ ملیح آبادی کو نت نئے پیرایوں میں برآمد کرتا رہے۔ یہ فرض کفایہ ادا کیا ہے محترم ڈاکٹر قمر رئیس صاحب، اقبال حیدر، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور ان کے معاونین فخر الکریم اور نعیم السحر صاحبان نے نئے کتابی سلسلے ''جوشؔ بانی'' کا اجراء کر کے جس کا پہلا شمارہ ''جوش بانی۔ ا'' منظر عام پر آ چکا ہے۔ اداریے میں قمر رئیس اقبال حیدر کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''ہمارا مقصد کسی جذباتی تحریک کے زیر اثر جوشؔ کی عظمتوں کا سراغ لگانا نہیں بلکہ اس مجلّے کے وسیلے سے جوش بیزاری اور بے اعتنائی کی اس فضا کو تحلیل کرنا ہے جو سرحد کے دونوں جانب دیکھی جاتی ہے۔''

جوشؔ بانی کی چونکہ یہ پہلی ہی اشاعت ہے اس لئے ظاہر ہے اس میں جوشؔ کی شاعری اور شخصیت کے بنیادی علائق و کوائف کا کسی قدر اعادہ ضروری تھا چنانچہ مصطفےٰ زیدی، عبادت بریلوی، محمد علی صدیقی، سید محمد عقیل، اور چند دیگر اکابرین کے مضامین جوشؔ کی شاعری میں انسانی عظمت، انقلابی فکر، فطرت نگاری اور اسی نوع کی معروف جہات پر اطلاق کرتے ہیں البتہ نامی انصاری کا مضمون ''جوشؔ یا فیضؔ'' اور نفیسؔ بانو کا مضمون ''جوشؔ کی دو نظموں کے نسائی کردار'' اور ان کی معنویت اور دیگر دو اک مقالات کچھ نئی گرہیں کھولتے ہیں۔ اسی طرح گفتگو کے تحت قمر رئیس، اقبال حیدر، عباسؔ زیدی، شائستہ رضوی، ناہید کاظمی، عرفان حیدر اور علی احمد فاطمی کے مکالمات جوشؔ کی طرف کچھ

نئے اپروچز کو سامنے لاتے ہیں۔ استفہامیہ باب 'سوال و جواب' بھی خصوصاً قابل توجہ ہے جس کے ذریعے جوش کی شاعری اور ادبی شخصیت کے متعلق کچھ اساسی سوال مشاہیر اور معاصر تنقید نگاروں کے روبرو رکھے گئے ہیں جن کے جوابات متعلقہ حضرات اپنے اپنے زاویۂ نظر کے اعتبار سے دیتے ہیں۔

جوش بانی سے یہ توقع یقیناً کی جاسکتی ہے کہ سلسلہ در سلسلہ جوش کی باز فہیم و باز دید کے امکانات کے در کھلتے چلے جائیں گے اور اس ضمن میں جوش ہی نہیں بیسویں صدی کے ادب کی تاریخ کے ساتھ بھی انصاف ہو سکے گا۔ کمپوزنگ اور طباعت کے اہتمام وضحت کے ساتھ شائع کردہ ۲۲۸ صفحات پر مبسوط جوش بانی کا یہ اولین شمارہ جس کی قیمت صرف پچاس (۵۰) روپئے کفایتی ہی کہی جائے گی، بڑے شوق و رغبت سے پڑھے جانے کا مستحق ہے۔ ☆☆

پردہ ہے ساز کا (شاعری)

مصنف: ساجدہ زیدی

مبصر: احمد محفوظ

ساجدہ زیدی اردو شاعری بالخصوص جدید نظم کے میدان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ہمارے زمانے کی خواتین شعراء میں ان کی حیثیت ایسی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زیر نظر مجموعہ پردہ ہے ساز کا ان کا پانچواں مجموعہ ہے جس میں ۱۳۱ نظمیں اور ۱۴ غزلیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں خود مصنفہ کا تحریر کردہ ایک طویل پیش لفظ بھی شامل ہے۔ بیس صفحات پر پھیلے ہوئے پیش لفظ کو دیکھ کر ذہنوں میں کچھ سوالات قائم ہو سکتے ہیں۔ پیش لفظ میں مصنفہ نے خاصی تفصیل کے ساتھ ان نکات کی نشاندھی کی ہے جو ان کی شاعری کے محرک ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تخلیقی مزاج و میلان کے بارے میں بھی مفصل اظہار خیال کیا ہے تاہم پیش لفظ کا بڑا حصہ ان امور اور تفصیلات کو سامنے لاتا ہے جن کی روشنی میں ان کی نظموں کو بقول مصنفہ پڑھا اور پرکھا جانا چاہئے۔ ان تفصیلات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مصنفہ نے اپنی بہت سی نظموں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کچھ

واضح اشارے بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس روشنی میں یہ سوال ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مجموعہ کلام میں ان تفصیلات کو بیان کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اردو نظم کی ایک اہم شاعرہ ہیں اور اردو کے قارئین ایک عرصے سے ان کا کلام پڑھتے رہے ہیں۔ نظم گوئی میں ان کا اپنا ایک انداز ہے اور اس انداز کو پہچانا جا سکتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں زیادہ تر نظمیں تو وہ ہیں جن میں انسان کی باطنی کیفیات کے مختلف رنگ شاعر کے داخلی تجربے میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں لیکن یہاں کچھ ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں موجود، عہد اور ماضی قریب سے تعلق رکھنے والی کچھ سفاک سماجی و سیاسی حقیقتوں کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں عراق اور گجرات کے واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجموعے میں شامل غزلیں محض روایتی انداز کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ مجموعہ صرف نظموں ہی پر مشتمل ہوتا تو اس کا اثر شاید زیادہ بھرپور ہوتا۔ ☆☆

ہجر و فراق کی نظمیں (شاعری)

مصنف: منیب الرحمٰن

مبصر: علی احمد فاطمی

ہجر و فراق۔ ممتاز و معروف شاعر منیب الرحمٰن کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی رفیقہء حیات کے انتقال کے بعد ہجر و فراق کی کیفیت میں کہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ منیب الرحمٰن کو اپنی بیوی سے بچھڑنے کا بے حد غم ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان نظموں میں صرف غم زدگی یا آہ و زاری ہو بلکہ ایک خاص قسم کی فلسفیانہ رمزیت اور تخلیقیت پائی جاتی ہے ان نظموں میں۔ کہیں کہیں فطرت، طلوع و غروب کا بھی خلاقانہ استعمال ہوا ہے۔ اپنے فطری غم میں شاعر نے اپنے شعور و جذبات کے ذریعہ ایک سنجیدگی اور بالیدگی پیدا کر دی ہے۔ منیب الرحمٰن خالص شاعر نہیں ہیں بلکہ دانشور اور اسکالر ہیں زندگی بھر تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی سے لے کر آک لینڈ یونیورسٹی تک کا سفر طے کیا ہے۔ چنانچہ رفیقہء حیات سے لے کر سفر حیات کے تمام پیچ و خم اور کیف و کم باہم رچ بس گئے ہیں۔ نظموں میں حیات و کائنات کے جلوے بھی بکھر گئے ہیں۔ یہ ایک سنجیدہ، عمدہ

شعری مجموعہ ہے جس کے پڑھنے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔

نہایت خوبصورت چھپا ہوا یہ مجموعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔☆☆

درد ابھی محفوظ نہیں (شاعری)

مصنف: انیس انصاری

مبصر: عزیزہ بانو

انیس انصاری دور حاضر کے ممتاز اور محترم شاعر ہیں۔ اپنے کئی اہم مجموعوں کے ذریعہ اپنی معتبر پہچان بنا چکے ہیں۔ یہ مجموعہ غالباً ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ کچھ مجموعے ہندی زبان میں بھی شائع چکے ہیں۔ اس مجموعہ کو معیار پبلی[illegible] دہلی نے شائع کیا ہے یعنی شاہد ماہلی نے جو خود ایک عمدہ شا[illegible] ہیں۔ ''قدر جوہر شاہ داند یا کہ داند جوہری''

درد ابھی محفوظ نہیں میں چند نظمیہ ضرور ہیں اور ایک نظم کے عنوان کو ہی مجموعہ کا نام دے دیا گیا ہے لیکن اس میں غزلیں زیادہ ہیں۔ لیکن یہ غزلیں بھی نظمیہ لب ولہجہ کے زیادہ قریب ہیں شاید اس لئے کہ انیس انصاری بنیادی طور پر نظم کے ہی شاعر ہیں اور میر و غالب سے زیادہ نظیر، انیس کے قبیل کے شاعر ہیں جن کے یہاں ایک خاص قسم کی سنجیدگی، درویشی اور قلندری پائی جاتی ہے۔ انیس انصاری ایک بڑے افسر ہونے کے باوجود فقیرانہ شان پر یقین رکھتے ہیں اسی نوعیت کے شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں [illegible] اور سماجی بصیرت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ مزاحمت اور احتجاج سے بھی دریغ نہیں کرتے اور موجودہ سماجی اور سیاسی شعور ان کی شاعری میں رچا بسا ہے۔ اس مجموعہ میں رنج والم اور درد وغم کو جس طرح ایک فلسفہ کی شکل میں پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ بلا شک و شبہ یہ مجموعہ اردو شاعری کی دنیا میں تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔☆☆

روح ادب: سجاد ظہیر نمبر (رسالہ)

مرتب: شہناز نبی

مبصر: حسین جیلانی

روح ادب بنگال اردو اکادی کا رسالہ ہے۔ تازہ شمارہ سجاد ظہیر نمبر ہے جس میں تقریباً اُنیس مضامین شامل ہیں۔ جن کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ سجاد ظہیر کے تمام پہلوؤں کو شامل کر لیا جائے۔ سجاد ظہیر کے ادبی تصورات کے ساتھ ساتھ سیاسی نظریات پر بھی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ سید محمد عقیل نے الہ آباد کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی نے تنقیدی رویوں پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ حسین الحق نے عصری معنویت۔ ظہیر انور نے ٹیگور کے ساتھ جوڑ کر دیکھا ہے۔ علی احمد فاطمی اور انیس رفیع نے لندن کی ایک رات پر مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر الماس شیخ کا مضمون اردو رسم الخط اور سجاد ظہیر عمدہ مضمون ہے۔ اسی طرح سے سجاد ظہیر کی شاعری اور نظم نگاری پر عمر غزالی اور اشفاق احمد نے عمدہ جائزہ لیا ہے۔ آخر میں سجاد ظہیر کی تحریروں کا ایک انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس سے اس خصوصی شمارہ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ایک کارآمد اور عمدہ شمارہ ہے جس کے لیے بنگال اردو اکادمی کے ارباب حل وعقد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ☆☆

بازیافت جشن زریں نمبر

مرتب: نذیر احمد

مبصر: نعیم السحر صدیقی

بازیافت شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کا مجلّہ ہے جو بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ ۳۹۲ صفحات پر مشتمل اس خصوصی شمارہ میں بیس مضامین ہیں۔ ابتدا میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے لے کر اردو کی موجودہ صورت حال پر خلیل احمد بیگ اور عتیق اللہ کے مضامین ہیں۔ اس کے بعد

جموں کا جائزہ ظہور الدین اور نصرت جودھری نے لیا ہے۔ اقبال پر عبدالحق، غزل پر قاضی جمال حسین کے مضامین عمدہ ہیں۔ سب سے تفصیلی اور معرکہ کا مضمون قمر رئیس کا ہے جس میں ترقی پسند ادب کے تناظرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ قاضی افضال حسین نے اردو تنقید اور ابن کنول نے اردو تحقیق کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ مضامین اور بھی ہیں مثلاً ڈرامے کا جائزہ شاہد حسین، افسانہ کا قدوس جاوید نے اور غزل کا ارتضٰی کریم نے لیا ہے۔ ایک مضمون اشتہارات کے کردا بھی ہے جسے اسلم جمشید پوری نے قلمبند کیا ہے۔ ابتدا میں نذیر احمد کا استقبالیہ ہے۔ سلیمان اطہر جاوید کا کلیدی خطبہ ہے اور حامدی کاشمیری کا بھی خطبہ ہے۔

عمدہ طباعت اور خوبصورت گٹ اپ میں یہ رسالہ ایک کتابی حیثیت رکھتا ہے جس کے لیے شعبۂ اردو اور خاص طور پر پروفیسر نذیر احمد مبارک باد کے مستحق ہیں۔☆☆

اثبات۔ نقش اول (رسالہ)

مرتب: اشعر نجمی

مبصر: عصمت نیلو انصاری

اثبات ایک نیا ادبی رسالہ ہے جو بڑے اہتمام اور اعلان کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے مثلاً سرورق پر اعلان ہے کہ۔ ''ادب کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان''۔ اندر انتساب کے ضمن میں لکھا گیا ہے۔ ''ان لوگوں کے نام جو ادب میں ادب کے ساتھ۔ ادب کے لیے اور ادب کے ذریعہ زندہ رہتے ہیں۔'' یہی اعلان اداریہ بعنوان بین السطور میں بھی ہے۔ اداریہ میں اپنی بات کی تقویت کے لیے جے ہلس ملر اور میلان کندیرا کی مثالیں ہیں۔ اداریہ کو بحث طلب ہونا چاہئے اور وہ ہے۔ اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے اور پرانی بحثیں بھی اٹھتی ہیں لیکن اس کو نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں تو ادب برائے ادب کی گونج سنائی دیتی ہے لیکن بعد میں کچھ توازن آجاتا ہے شمس الرحمٰن فاروقی کی غزلیں ہیں۔ فاروقی کا طویل مضمون ہے اس لیے جدیدیت کی گونج ناگزیر ہے

لیکن توازن اشعر نجمی کا اپنا ہے۔ اقبال اور لینن کے عنوان سے عمران شاہد بھنڈر کا مضمون عمدہ ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ اشعر نجمی نے مختلف خیال کی چیزیں شامل کی ہیں۔ مابعد جدیدیت کے خلاف چیزیں زیادہ ہیں۔ گبرئیل گارسیا مارکیز کا گوشہ ہے اور پریم چند کی کچھ چیزیں لیکن وہی جو پریم چند کی ترقی پسندی کو بحث طلب بناتی ہیں۔ تین افسانوں میں دو پاکستان کے ہیں اور ایک ہندوستان کا۔ آخر میں ناصر بغدادی کا فوک نیزہ پر حرف حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ادبی نقطہء نظر سے ایک عمدہ ادبی رسالہ ہے۔ جس کا استقبال کیا جانا چاہئے یقینی ہے کہ اس کا دوسرا شمارہ بھی اسی معیار سے جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ ☆☆

اردو میں ترقی پسند تنقید

مصنف: مخمور صدری

مبصر: نعیم السحر صدیقی

'اردو میں ترقی پسند تنقید' ڈاکٹر مخمور صدری کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں انھوں نے ترقی پسند تنقید کو تذکروں سے تلاش کیا ہے اس کے بعد حالی اور ان کے معاصرین کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ لیکن اصل ترقی پسند تنقید تو ترقی پسند تحریک سے شروع ہوتی ہے اس لئے ابتداً تحریک کا تعارف اور اغراض و مقاصد کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ترقی پسند تنقید کیا ہے اس پر نظریاتی اور منطقی بحث کے بعد تفصیل سے ترقی پسند نقادوں کا ذکر ہے۔ ابتدا سے یعنی اختر حسین رائے پوری سے لے کر علی احمد فاطمی تک کا تفصیلی تذکرہ اور جائزہ ہے۔ درمیان میں سجاد ظہیر، عبد العلیم، سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری اس کے بعد احتشام حسین، ممتاز حسین، محمد حسن، آل احمد سرور، سید محمد عقیل، شارب ردولوی، قمر رئیس کی تنقیدات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور سب سے آخر میں ترقی پسند ادب کے معترضین کا بھی ذکر اور جواب ہے۔ ترقی پسند تنقید کے ضمن میں یہ ایک اہم کام ہے۔ جس کی دستاویزی حیثیت ہے۔ جس کے لئے نوجوان مصنف مخمور صدری مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ☆☆

رپورٹ

سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار: جوش ملیح آبادی فکر وفن

۱۸ـ۱۶ مئی ۲۰۰۸ء غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب دہلی

دور حاضر میں انسانی اقدار کی پامالی، فردواحد کی محرومیوں اور زندگی کے دیگر مسائل کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونے سے بعض نظریات کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے تو بعض نظریات غیر موزوں بھی ہو گئے ہیں۔ انسانی اقدار کی پامالی اور مختلف تعصبات کے باعث انسان اور انسان کے درمیان حائل دیوار کو ختم کرنے کی ضرورت آن پڑی ہے۔ بنی نوع انسان کی صلح و آشتی اور فلاح کے ضمن میں شعراء کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی فکر کے نقیب جوش ملیح آبادی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور دور حاضر میں جوش کی معنویت کو دریافت کرنے کے لئے غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے ایک سہ روزہ سیمینار بعنوان 'جوش ملیح آبادی فکر وفن' کا انعقاد کیا۔ جس میں ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں اور دانشوروں نے اپنی موجودگی سے نہ صرف سیمینار کو رونق بخشی بلکہ جوش فہمی کے سلسلے کو مہمیز بھی کیا۔ پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب اقبال حیدر (کنیڈا)، محترمہ شائستہ رضوی (کنیڈا)، جناب اسد مفتی (ہالینڈ)، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی، پروفیسر عقیل رضوی، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر شمیم حنفی۔ زبیر رضوی، پروفیسر عتیق اللہ پروفیسر فضل امام، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر علی جاوید وغیرہ کی موجودگی سیمینار کی کامیابی ضامن ہوئی۔

سیمینار کا افتتاحی اجلاس ۱۶ر مئی کو شام ۷ بجے ایوان غالب کے آڈی ٹوریم میں منعقد

ہوا۔ جس کی صدارت جناب سید شاہد مہدی صاحب نے کی اور افتتاح کی رسم پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے ذریعے ادا ہوئی۔ سیمنار کے باقاعدہ افتتاح سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب شاہد ماہلی صاحب نے استقبالیہ تقریر کی۔ اس کے بعد جناب شاہد مہدی، پروفیسر عقیل رضوی، جناب اسد مفتی، جناب اقبال حیدر اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو گلدستہ پیش کر کے خیر مقدم کیا نیز غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے اغراض و مقاصد پر مختصر اروشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا مقصد غالب اور عہد غالب کی تفہیم ہے۔ یہاں تحقیقی امور کے لئے ایک وقیع کتب خانے کا قیام کیا گیا ہے۔ جلسے منعقد کرنے کے لئے آڈی ٹوریم ہے اور غالب سے وابستہ چیزوں کو یکجا کر کے ایک میوزیم بھی آراستہ کیا گیا ہے۔

جوش کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں کہ جوش انقلاب اور رومان کا شاعر ہونے کے ساتھ تضادات کے شاعر تھے لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پروفیسر عقیل رضوی نے افتتاحی خطبہ پیش کرتے ہوئے جوش سیمنار کے انعقاد پر غالب انسٹی ٹیوٹ اور اس کے اراکین کو مبارک باد پیش کی مزید فرمایا کہ جوش کے پاکستان چلے جانے کے باعث ہندوستان کے لوگوں نے انھیں فراموش کر دیا وہیں پاکستان کے لوگوں نے بھی انھیں ذہنی طور پر قبول نہیں کیا نتیجتاً جوش پر خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہو پایا۔ پاکستان میں حفیظ جالندھری گروپ نے ان کی مخالفت کی جس سے وہ بیزار ہو گئے۔ ان پر لامذہبیت اور انگریزی سے بے بہرہ ہونے کا الزام بھی لگا جب کہ جوش کی Senior Cambridge تک کی تعلیم St. Peters College آگرہ میں ہوئی تھی۔ جوش پر یہ الزام لگانا بھی انصاف پر مبنی نہیں کہ ان کے یہاں مربوط فکر ناپید ہے اور یہ کہ وہ صرف لفظوں کے جادوگر ہیں۔

پروفیسر عقیل رضوی واضح کرتے ہیں کہ عظیم شاعری میں مربوط فکر کا ہونا لازم نہیں۔ اردو کے کئی بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں فکری نظام کا فقدان ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ جوش کے یہاں بھرپور سیاسی شعور ملتا ہے۔ جوش کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ ان کی شاعری میں حیدر آباد کے سفر کے بعد رومانوی عناصر نمایاں ہوتے ہیں۔ پھر 1930 کے بعد ان کے شعری رجحانات میں تبدیلی رونما ہوئی اور وہ انقلابی نظمیں لکھنے کو مائل ہوئے۔ کسان آندولن سے متاثر ہو کر معرا کتہ الآرا

نظم، کسان کی تخلیق کی ۱۹۶۰ء کے بعد مزید تبدیلی ہوئی اور 'وقت' جیسی نظم منظر عام پر آئی۔ آخر میں پروفیسر رضوی فرماتے ہیں انکی ایک تصنیف 'حرف آخر' ہے جو نایاب ہے اس کی تلاش ہونی چاہئے نیز یہ کہ ان کی بکھری ہوئی تصنیفات کو یکجا کر کے ایک اہم کارنامہ جوش فہمی کے لئے کیا جا سکتا ہے۔

افتتاحی تقریر کے بعد کینیڈا کے مہمان جناب اقبال حیدر نے جوش کی عصری معنویت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ابھی تک ان کی عمیق اور بسیط شاعری میں فکر کے عناصر کی دریافت نہیں کی جا سکی ہے۔ نیز یہ کہ عہد حاضر کو جوش کی ضرورت ہے۔ ہالینڈ کے مہمان جناب اسد مفتی فرماتے ہیں کہ یادوں کی برات کی وجہ سے انکی شخصیت مجروح ہوئی اور جوش کی شاعری کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ خواجہ ثانی نظامی فرماتے ہیں کہ جوش صاحب کی شاعری پر غور و فکر ہونی چاہیے نہ کہ انکی ذاتی زندگی پر بیجا سوال کھڑا کرنا چاہیے۔ مزید فرماتے ہیں کہ جوش کا ادبی رویہ غیر مقلدانہ ہے۔ اجلاس کی صدارتی تقریر میں جناب سید شاہد مہدی نے فرمایا کہ موجودہ دور میں انسان جن مسائل سے نبرد آزما ہے اس میں جوش کی شاعری بہت اہم اور مفید کردار ادا کر سکتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ فنکار کی ذاتی زندگی میں مصائب ہو سکتے ہیں کیونکہ بالآخر وہ انسان ہے لیکن اس سے اس کے فن پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے بعد جوشیات پر مبنی جریدہ 'جوش بانی' کے افتتاحی شمارے کا رسم اجراء جناب اقبال حیدر جناب سید شاہد مہدی۔ پروفیسر عقیل رضوی کے ذریعہ ہوا۔ اسکے بعد 'شام غزل' کا اہتمام ہوا جس میں مشہور صوفی گلوکار ضلع خان نے غزلیں پیش کیں۔

۷ امئی ۲۰۰۸ء

سیمنار کے دوسرے دن یعنی ۷ امئی ۲۰۰۸ء کو چار اجلاس منعقد ہوئے۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر عقیل رضوی اور جناب اسد مفتی صاحب نے کی۔ جب کہ نظامت کی ذمہ داری غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر سہیل انور صاحب نے سنبھالی۔ اس اجلاس میں کل چار پرچے پڑھے گئے جس میں پروفیسر فضل امام رضوی، جناب کوثر مظہری اور سلیمان اطہر جاوید صاحب کے مقالے شامل تھے۔ پہلا پرچہ جناب کوثر مظہری صاحب نے ''جوش کی فکری کشمکش'' کے عنوان سے پیش کیا۔ فرماتے ہیں کہ جوش CONFLICT کے شکار تھے اور اپنی فکر کی دریافت نہیں کر پائے نیز جوش

کے یہاں مذہبی اقدر کا احترام نہیں ہے اور ان کے یہاں عشق عیاشی کے مترادف ہے۔ دوسرا پرچہ سلیمان اطہر جاوید صاحب نے ''جوش اور حیدر آباد'' کے عنوان سے پیش کیا۔ جس میں جوش کے حیدر آباد کے سفر پر سیر حاصل بحث کی۔ جاوید صاحب نے واضح کیا کہ جوش حصول معاش کے لئے سفارشات لے کر حیدر آباد کے دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔ وہاں کے دارالترجمہ میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت ملی، منشی ذکا اللہ کی رفاقت حاصل ہوئی اسی دوران فانی بھی حیدر آباد پہنچے۔ حیدر آباد کے دس سالہ قیام میں جوش نے جشن نو، آتے نہیں ہو تم، غدار سے خطاب، ''کوہستانِ دکن کی عورتیں'، وغیرہ نظمیں لکھیں۔ جوش نے ایک نظم اور لکھی جو نظام کی مخالفت میں تھی، اس کی پاداش میں ان پر لامذہبیت کے الزامات عائد کئے گئے، انھیں معتوب کیا گیا نتیجتاً جوش نے حیدر آباد کو خیر باد کہہ دیا۔ ''مراثی جوشؔ اور انسانی حقوق'' کے عنوان سے پروفیسر فضل امام نے اپنا وقیع مقالہ پیش کیا۔ واضح کیا کہ مراثی جوش میں انسانی حقوق کی مضبوط حمایت نظر آتی ہے۔ اصلاً ان کی مرثیہ نگاری میں آہ و بکا کے بجائے ذہنی بیداری کے عناصر ملتے ہیں۔ حقوق انسانی کے لئے شہادت پانے والے حضرت امام حسینؓ جوش کے نزدیک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ جوش آفاقی اور بین الاقوامی مسائل کو فن کا لحاظ رکھتے ہوئے برتتے ہیں۔ جوش قومیت کی مخالفت اور بنی نوع انسان کی فلاح اور بہتری کی حمایت کرتے ہیں اور مرثیہ کے ذریعے انسانی عظمت اور اقدار کی بحالی، اور معاشرہ کی بہتری کرنے کے خواہاں ہیں، یہی جوشؔ کا امتیازی پہلو ہے اور پھر عہد حاضر کے مسائل میں اس فکر کی اہمیت اور معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ اجلاس کی صدارتی تقریر میں پروفیسر عقیل رضوی نے کوثر مظہری کے مقالے پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا کہ جوش کو صرف 'یادوں کی برات' کے ذریعے کیوں سمجھا جاتا ہے۔ کسی کی ذاتی زندگی میں کسی کو جھانکنے کا حق حاصل نہیں۔ سلیمان اطہر جاوید کے متعلق فرماتے ہیں کہ انھیں ماخذات کا ذکر بھی کرنا چاہیے تھا جو آئندہ محققین کے مطالعے کے لئے سودمند ہوتا۔ پروفیسر فضل امام کے حوالے سے فرمایا کہ مقالہ وقیع اور معنی خیز تھا۔ صدر ثانی جناب اسد مفتی نے پروفیسر فضل امام کے مقالے کی تعریف و تحسین کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر فضل امام نے کی۔ نظامت ڈاکٹر محمد اکمل نے کی۔ پہلا پرچہ کینڈا سے آئی مہمان محترمہ شائستہ رضوی نے پیش کیا۔ عنوان ''جوش تجسیم محسوسات کا شاعر''

تھا۔ شائستہ رضوی صاحبہ نے اشعار کے ذریعہ جوش کی حسی شاعری پر تاثراتی بحث کی نیز فرمایا کہ ان کے یہاں رجائیت کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ 'یادوں کی برات' ایک تہذیبی بازیافت، کے عنوان سے پروفیسر ابولکلام قاسمی نے مقالہ پیش کیا۔ واضح کرتے ہیں کہ جوش نے یادوں کی برات میں اپنے دور کی مٹتی ہوئی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ ''یادوں کی برات'' دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ذاتی زندگی پر مبنی ہے جب کہ دوسرا حصہ قابل ذکر ہستیوں کے تزکرے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں کچھ غیر اہم شخصیات کا خاکہ بھی ہے۔ نیز فرمایا کہ جوش بہت جذباتی اور دردمند دل کے حامل تھے اور یہ کہ انھوں نے اپنے نقائص کی پردہ پوشی نہیں کی بلکہ ان کا برجستہ اظہار کیا ہے۔ اجلاس کا آخری پرچہ ممتاز ناقد جناب وہاب اشرفی صاحب نے بعنوان 'مرثیہ جوش کی عصری معنویت' پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ جوش نے مرثیے میں الگ راہ بنائی۔ کلاسیکی طریقہء کار سے گریز کر کے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ استحصالی دور میں احتجاج کا الم بلند کیا جسکی عہد حاضر میں سخت ضرورت ہے۔ جوش کے نزدیک حضرت حسینؓ کا کردار مثالی ہے مزید یہ کہ جوش کے لئے شکست و فتح ضمنی ہے۔ وہاب اشرفی نے مزید فرمایا کہ جوش کی مخالفت سطحی ملائیت پر مبنی ہے۔ پروفیسر رضوی نے ''جوش کی شاعری میں انقلاب، بغاوت اور ملی ٹنسی کے عنوان سے مقالہ پیش کیا''۔ جوش کا مزاج فطری طور پر انقلابیوں سے ہم آہنگ تھا جب بھگت سنگھ کو پھانسی ہوئی تو جوش لاہور میں ہوئی تعزیت میں شریک ہوئے۔ مزید فرماتے ہیں کہ شاعری جب بھی فکری طور پر معاصر مسائل سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو محض نعرہ بازی نہیں رہ جاتی۔ نیز یہ کہ جوش کے یہاں آزادی کی خواہش شدت سے پائی جاتی ہے۔ جوش کے یہاں غلامی کی جاودانی زندگی سے آزادی کا ایک لمحہ بہتر ہے۔ صدارتی خطبہ میں پروفیسر فضل امام نے شائستہ صاحبہ کے مقالے کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور ابولکلام قاسمی کے مقالے کو بھی سراہا۔

دن کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے کی۔ پہلا مقالہ الہ آباد یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر نعیم السحر صدیقی نے ''جوش کا تصور عظمت انسان'' کے عنوان سے پیش کیا۔ واضح کرتی ہیں کہ انسان کائنات کا مرکز ہے۔ اس کی فلاح و بہبود کا انحصار حریت پر ہے۔ نسلی، جغرافیائی اور نصبی تعصبات سے قطع نظر عظمت انسان اور احترام آدمیت ہی جوش کی فکر اور شاعری کا محور ہے۔ نیز یہ کہ مذہب، نسل و رنگ کی تفریق

انسانی وحدت میں خلل کا درجہ رکھتی ہے۔فرید پربتی نے 'جوش کی رباعیاں' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔جوش کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جوش اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں نو کلاسیکل رویہ نظر آتا ہے۔نیز یہ کہ جوش نے موضوعاتی تنوع پیدا کیا اور نئی جہت تراشی کے ذریعے۔موضوع کو فنی تکمیل سے آراستہ کیا۔حرکت و عمل،حصول اقتدار کی ترغیب اور حسن و عشق کو اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا۔فنی محاسن کے ساتھ ڈرامائی عناصر کو داخل کر کے کلام میں زور پیدا کیا۔منظر نگاری اور جمالیات کی عمدہ مثالیں پیش کیں۔رباعی کو جدید نظم سے ہم آہنگ کیا۔لسانی اعتبار سے رباعی کو پختہ کیا۔حسن بیان اور لطف زبان، لہجے کی صلابت ان کی رباعی کے دیگر اوصاف ہیں۔جوش کی رباعیات اردو شاعری کا سرمایہ ہیں نیز یہ کہ جوش اردو شاعری کے عمر خیام ہیں۔مقالے پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمن نے اظہار خیال کیا کہ نعیم السحر صدیقی کو اپنے مقالے میں اقبالؔ کا حوالہ ضرور دینا تھا کیونکہ جوش اقبالؔ سے متاثر تھے۔صدارتی تقریر میں عتیق اللہ نے فرمایا کہ فرید پربتی کو رباعی کے فن پر بھی بحث کرنی چاہیے تھی۔نیز جوش پر بات کرتے ہوئے اقبالؔ کا نام بھی آئے گا کیونکہ اقبالؔ بیسویں صدی کے شعری فضا پر اثر انداز ہیں۔قمر رئیس نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ جوش کو برصغیر میں نظر انداز کیا گیا۔دور حاضر میں جوش کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔عصر حاضر میں جوش کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔دن کے چوتھے اور آخری اجلاس میں پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر صادق نے صدارت کی نظامت ابوظہیر ربانی نے کی۔پہلا مقالہ لئیق رضوی نے ''شخصی مرثیہ گوئی اور جوش'' کے عنوان سے پیش کیا۔فرماتے ہیں کہ شخصی مرثیہ گوئی جوش کو وراثت میں ملی۔جوش نے کل گیارہ شخصی مرثیے لکھے جس میں والد، بڑی بہن، جگت موہن لال رواں اور جواہر لال نہرو کے مرثیے شامل ہیں۔جوش نے شخصی مرثیہ نگاری میں نئے رنگ بھرے۔درد کی فطری فضا، اور جذباتیت کا غالب رنگ نمایاں ہے۔زبان و بیان میں برجستگی ہے۔''جوش اور غزل'' کے عنوان سے پروفیسر لطف الرحمن نے مقالہ پیش کیا۔فرماتے ہیں کہ جوش فطری طور پر غزل گو شاعر تھے۔ان کی نظموں میں بھی رنگ تغزل صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔نیز یہ کہ جوش میرؔ اور غالبؔ سے بہت متاثر تھے بعد میں غزل کے مخالف ہو گئے اور غزلیں کہنا ترک کر دیا۔جس سے ان کا شعری سرمایہ محدود ہو گیا۔مزید فرمایا کہ جوش نے انقلاب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔صدارتی خطبے میں

پروفیسر علی احمد فاطمی نے پروفیسر لطف الرحمٰن سے اختلاف کرتے ہوئے واضح کیا کہ جوش بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے نیز یہ کہ انکی غزلوں میں بھی نظمیہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر فاطمی مزید فرماتے ہیں کہ للکار کی شاعری اور فریاد کی شاعری میں فرق تو ضرور ہوگا اور جوش کے یہاں للکار کی شاعری ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ جوش کلاسیکی شعریت سے واقف تھے لیکن منفرد لب و لہجہ اختیار کیا۔ اور شعری دنیا کو وسعت دی، ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے نئی بوطیقا کی دریافت کرنی ہوگی۔ پروفیسر صادق نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ لئیق رضوی کا مقالہ بہت وقیع تھا۔ وہیں لطف الرحمٰن کا مقالہ بہت چونکا دینے والا تھا، بہت فکر انگیز اور پروفیسر صادق نے سوال قائم کیا کہ کیا وجہ تھی کہ جوش غزل سے ہٹ کر نظم کہنے لگے۔ ترک وطن اور ترک غزل کو جوش کی بڑی غلطی قرار دیا۔

۱۸ مئی ۲۰۰۸ء

سیمنار کے تیسرے اور آخری دن تین اجلاس میں مقالے پیش کئے گئے اور آخری اجلاس شرکا کے تاثرات اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اظہار تشکر پر مبنی تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب نے کی۔ نظامت جناب ممتاز عالم صاحب نے کی۔ پہلا مقالہ معروف ترقی پسند ناقد پروفیسر قمر رئیس نے ''جوش کے احتجاجی لہجے کی معنویت' کے عنوان سے پیش کیا۔ فرماتے ہیں کہ جوش کی شاعری بہت عمیق اور بسیط ہے جس میں خصوصی طور پر انقلابی اور احتجاجی عناصر منفرد اور اہمیت کے حامل ہیں۔ احتجاج میں تہہ داری ہے۔ مذہب کے پیشواؤں کے خلاف، انسانی نابرابری کے خلاف اور سرمایہ داروں کے خلاف ان کی احتجاجی آواز بلند ہوجاتی ہے۔ مذہب، نسل اور ملک کی تنقید اس لئے کرتے ہیں کہ اس نے بنی نوع انسان کو جکڑ دیا ہے نیز فرماتے ہیں کہ روشن خیالی کے ساتھ سائنسی بصیرت اور نظریہ علم بھی جوش کو منفرد مقام پر جلوہ افروز کرتا ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ بچپن میں جوش مذہبی رواداری رکھتے تھے لیکن بعد میں رویہ تبدیل کر دیا جس کی پاداش میں ان کے والد ماجد نے انھیں بے دخل کر دیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر خلیق انجم نے بعنوان ''صف اول کے مکتوب نگار: جوش'' پیش کیا۔ فرماتے ہیں کہ جوش کی خطوط نگاری کو نظر انداز کیا گیا۔ جب کہ کسی کی سوانحی زندگی کو سمجھنے کے لئے خطوط کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ان کے خطوط سے

معلوم ہوتا ہے کہ جوش نے اٹھارہ سے زیادہ عشق کئے لیکن زیادہ توجہ سمن نام کی معشوقہ پر رہی نیز فرمایا کہ آخری وقت معاشی دشواریوں میں گزرا۔ اجلاس کا آخری مقالہ جناب زبیر رضوی نے 'جوش کا تخلیقی وفور پاکستان کی تین دہائیوں کے حوالے سے' پیش کیا۔ تعجب ظاہر کیا کہ وہ اسلامی مملکت پاکستان کیوں چلے گئے جب کہ مذہب ان کے یہاں بہت عظیم حیثیت کا متحمل نہیں۔ مزید فرمایا کہ پاکستان جاکر وہ ایک طرح سے ٹھگ لئے گئے۔ جوش نے آدمیت اور انسانی اقدار کو اپنا عقیدہ بنالیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر وہاب اشرفی قمر رئیس کے متعلق فرماتے ہیں کی جوش کی عظمت کی دریافت کے لئے انکی شعری جہات کی دریافت کی ضرورت ہے۔ مقالے میں بحث کی بہت گنجائش ہے۔ خلیق انجم کے مقالے کے متعلق فرماتے ہیں کہ خطوط میں بھی اکثر جھوٹ ہے، نیز انکے مقالے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انکے خطوط شائع ہونے چاہیے۔ وہاب اشرفی، زبیر رضوی کے متعلق فرماتے ہیں کہ جوش کے یہاں تناؤ کی شاعری ہے، اس پر بھی زبیر رضوی کو بحث کرنی چاہیے تھی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت جناب خلیق انجم اور پروفیسر لطف الرحمٰن صاحب نے کی۔ نظامت کی ذمہ داری محترمہ وسیم راشد نے نبھائی۔ پہلا پرچہ پروفیسر عتیق اللہ نے 'جوش فہمی کی طرف ایک قدم' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے اظہار خیال کیا کہ جوش اقبالؔ سے متاثر تھے اور جوش کے یہاں بھی خودی کا فلسفہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اس کی نوعیت میں فرق ہے نیز فرماتے ہیں کہ جوش کو اب تک ٹھیک سے پڑھا نہیں جا سکا ہے۔ لفظیات حاوی ہو جانے کے باعث فکر پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ شمیم حنفی نے اپنے مقالہ میں اظہار خیال کیا کہ اقبال اور جوش کے منظل کینوس اور ان کے مسائل الگ الگ ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ معاصر ادبی فضا میں جوش کا منفرد مقام ہے۔ ہندی اور انگریزی ادب سے بھی متاثر ہیں، مہاجنی اور سامنتی تہذیب کا تانا بانا بھی جوش کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کی معنویت عصر حاضر میں بہت اہم ہے۔ اقبال حیدر نے 'جوش ایک مفکر شاعر' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ فرماتے ہیں کہ Metaphysics کا کام صرف وجود کا اثبات کرنا ہی نہیں بلکہ وجود مطلق پر سوال کھڑا کرنا بھی ہے اور جوش کو اسی کارنامے پر معتوب کیا گیا۔ اقبال حیدر کے نزدیک جوش کی شاعری کی عورت اور ان کی نجی زندگی کی عورت میں کوئی فرق نہیں نیز جوش کے

تصورِ حسن اور ان کی لفظیات پر بات کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ معنوی نظام غالب کے بعد جوش کے یہاں ہی نظر آتا ہے اور جوش کے یہاں غیر معمولی حسیت پائی جاتی ہے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر لطف الرحمٰن نے عتیق اللہ کے مضمون اور اس کی جہت کی تعریف کی نیز شمیم حنفی کے مقالے کو بھی سراہا۔ اقبال حیدر کے مقالے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے Metaphysics کے حوالے سے بہت معنی خیز بات کہی ہے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت جناب زبیر رضوی اور ڈاکٹر علی جاوید نے کی۔ نظامت کی کاروائی شاہینہ تبسم صاحبہ نے کی۔ پہلا پرچہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے ''جوش کی شخصیت کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ جوش دین اور خدا کے نہیں بلکہ راسخ لعقید گی کے خلاف تھے۔ جوش جذباتی اور انسان دوست تھے اور انسان کو مجبور دیکھ کر کڑھتے تھے نیز انسان کی فلاح اور معاشرے کی بہتری کے لئے کوشاں تھے لیکن جوش مفکر نہیں تھے صرف شاعر تھے۔ مزید فرماتے ہیں کہ جوش نے عشق کو اہمیت ضرور دی ہے لیکن 'ان کا عشق عیاشی تک محدود تھا۔ اسکے بعد ڈاکٹر مولیٰ بخش نے 'جوش کا فکری نظام' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ جوش نے اقبال کی طرح منضبط فکر کی ترویج نہیں کی اور نہ ہی جوش کے تصورات تادیر کسی نکتہ پر قائم رہتے ہیں نیز یہ کہ جوش نے جذبات کو فلسفہ پر ترجیح دی ہے۔ مولا بخشی کو جوش کے اشعار میں عقل اور عشق کے تصورات میں تضاد بھی نظر آتا ہے۔ اجلاس کا آخری مقالہ معروف ترقی پسند ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے مارکسی تصور جمالیات اور جوش کے عنوان سے پیش کیا۔

اپنے وقیع مقالے میں جوش کی جمالیات کے عناصر ترکیبی کو دریافت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حقیقت کی اپنی جمالیات ہوتی ہے۔ جوش کی شاعری کا مرکز ومحور انسان اور کائنات ہے نیز یہ کہ کوئی بھی جمالیاتی قدر سماجی قدر سے الگ نہیں ہوتی، اس کے علاوہ جوش کے یہاں مارکسی جمالیات اور ہندوستانی جمالیات کی خوبصورت آمیزش ہے۔ مزید براں بڑی شاعری کو کسی ایک نکتہ پر رکھ کر نہیں دیکھا جاسکتا اور بڑا شاعر اپنے افکار کے ذریعے قاری کا امتحان بھی لیتا ہے۔

زبیر رضوی نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ہمیں کسی بھی شاعر کی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہئے نہ کہ اس کی زندگی میں بیجا تانک جھانک کرنی چاہیے۔ صدر ثانی ڈاکٹر علی جاوید نے اظہار

خیال کیا کہ کوئی بھی شاعری اگر منثور پر ہوگی تو وہ شاعری نہیں ہوگی اور نہ ہی اس میں آفاقیت ہوگی۔ نیز یہ کہ جوش کے یہاں انسان بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور وہ رنگ نصب کی تمیز کو ختم کرنا چاہتے ہیں مزید براں جوش کے یہاں انیسؔ اور دبیرؔ سے بہتر منظر نگاری پائی جاتی ہے۔

چوتھا اجلاس تاثرات پر مبنی تھا جس کی صدارت ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر عقیل رضوی نے کی۔ اقبالؔ حیدر تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سیمنار کے ذریعے جوش فہمی کی جانب ایک بڑا قدم اٹھایا گیا ہے۔ امید جتاتے ہیں کہ فکر جوش کی مزید ترویج ہوگی۔ نعیم السحر صدیقی فرماتی ہیں کہ جوش کو ایک بار پھر سے پڑھنے کی خواہش جاگی ہے۔ کینڈا کی مہمان شائستہ رضوی فرماتی ہیں کہ جوش پر مسلسل بحث ہونی چاہئے۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم عبدالحی نے اظہار خیال کیا کہ عہد حاضر میں ہم جوش سے کیا سیکھ سکتے ہیں اور کیا حاصل کر سکتے ہیں یہی مطالعۂ جوش کا موجب ہے نہ کہ یہہ کہ انھوں نے کتنے عشق کیے، نیز یہہ کہ فن کار کا فن اہم ہوتا ہے اس کی ذاتی زندگی کو ہدف تنقید بنانا غیر مناسب ہے۔ صدارتی تقریر میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے فرمایا کہ ان پر مزید سیمنار کیے جائیں تاکہ جو گوشے زیر بحث نہیں آسکے ہیں وہ بھی سامنے آجائیں۔ آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور امید جتائی کہ غالب انسٹی ٹیوٹ آگے بھی جوشیات پر کام کرے گا۔

رپورٹ: عبدالحی
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

☆☆☆

خطــــــوط

برادرم۔ تسلیم

آپ لوگ قابل مبارکباد ہیں کہ بروقت جوش بانی کا اجرا کیا۔ جوش پر جتنا کام ہونا چاہئے تھا اس کا عشرعشیر بھی نہ ہو سکا۔ ہم ان کا کام بھلا کر صرف نام دہراتے رہے [اور وہ بھی کتنے] جوش کے انتقال کے بعد کچھ رسائل کے نمبر ضرور نکلے جن میں کچھ تنقیدی، تجزیاتی اور اکثر جذباتی و تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ شاید زمانی قربت کی وجہ سے اس وقت معروضی انداز میں موضوع کا مطالعہ ممکن بھی نہ تھا۔ اب جوش اور ان کے قاری کے درمیان مناسب فاصلہ ہو گیا ہے ان کا معروضی مطالعہ نسبتاً آسان ہوگا۔ جوش کی شاعری میں کئی پہلو ہیں ہر پہلو پر مضامین نہیں کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ جوش کی زبان تشبیہات و پیکر تراشی۔ طنز، وقتی موضوعات، تصور انقلاب، رومان وشبابیات، خمریات، ہیتی، لفظیات روشن موضوعات ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات سب سے پہلے مکمل کلام جوش کی اشاعت پر خصوصی توجہ دینگے بہرحال جوش بانی کا سلسلہ یوں ہی قائم رہے۔

اورنگ آباد

بشر نواز

☆

محب مکرم

نذر تسلیم بصد تعظیم قبول فرمائیے۔

جوش بانی کا بیش قیمت تحفہ ملا۔ سبحان اللہ۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ پہلی مسرت تو یہ کہ آنجناب نے اس خاکسار کو اس ہر آئینہ محترم اور قابل مطالعہ صحیفہ کا مستحق سمجھا۔ دوسری خوشی یہ کہ بہت سلیقے اور نفاست کے ساتھ تزین و ترتیب ہوئی ہے۔ تیسری اور حقیقی معنوں میں بے انتہا خوشی یہ ہوئی کہ ہماری غریب زبان میں ایسے قدر شناسانِ ادب موجود ہیں (کم ہی سہی) جو ارباب فن وشعر کی قدر و منزلت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یقین مانیئے اگر حضرت جوش جیسا آتش نفس شاعر کسی اور زبان میں

ہوتا تو۔۔۔خیر چھوڑئیے بھی۔ میں ذاتی طور پر آپ سب کا احسان مند ہوں کہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے لئے آپ نے یہ کام سنبھالا ہے۔ حضرت جوشؔ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ ۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

کچھ گستاخی اور کچھ بے ادبی کے ساتھ یہ تو کہوں گا کہ آپ لوگوں کی مساعی سے "ہر زبان پکارے گی ہمارے ہیں جوشؔ" ذرا اردو کو سنبھل تو جانے دیجئے۔

لیڈز قیصر تمکین

☆

محبّ مکرم فاطمی صاحب۔ آداب

جوشیات پر مشتمل عالمی جریدہ جوشؔ بانی موصول ہوا۔

جوشؔ کے سلسلے میں ناحق لوگ صف آراء ہیں۔ جوشؔ نظم کے شاعر ہیں اور زبردست شاعر ہیں۔ جگر سے بھی تقابل ہوا ہے۔ جگر غزل کے خوش گو شاعر ہیں۔ صرف ایک لفظ میں ان کی شاعری کا Essence والہانہ سرمستی ہے۔ جہاں تک اقبال کا سوال ہے تو جوشؔ کے ساتھ گھسیٹنا بیکار ہے۔ اقبال کے پاس ایک منظم فلسفہء حیات ہے۔ جس میں صرف یہ دیکھنا ہے کہ جوشؔ اپنی شاعرانہ صلاحیت یعنی Potentiality اور Dormant quality کو کھنگالنے میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ آپ کچھ بھی کہئے نظم گوئی میں ان کا کوئی ثانی نہیں (بہ استثنائے اقبال) الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ لفظ کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے، پھر یہ محض الفاظ کا انبار نہیں لگاتے شعری جذبہ پیش نظر رہتا ہے۔ جوش کی شاعری محض Vertification بلکہ Poetry ہے۔ اب قادرالکلام شاعر انیس ہے یا جوشؔ۔ جو شعرا جوشؔ کو Poor شاعر کہتے ہیں جوش کو Follow کرتے ہوئے ایک آدھ شعر کہہ کر دیکھیں۔ قدم قدم پر لڑکھڑائیں گے۔

بلا شبہ جوش اقبال کی طرح عظیم شاعر تو نہیں مگر ہمارے بڑے شاعروں میں ایک شاعر ہیں۔ اردو شاعری میں ان کے Contribution کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شاعر جس کو احساسات و جذبات وافکار کے اظہار پر حاکمانہ قدرت ہو جس نے نظم گوئی کو لباس شاہی عطا کیا ہو

اس پر تنقید محض برائے تنقید ہے اس تنقید سے جوش کا قد کم نہیں ہوتا۔
شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنا موقر جریدہ اس حقیر کو ارسال کیا۔ دلی شکریہ

علی گڑھ سید امین اشرف

☆

برادرم فاطمی صاحب

جوش بانی ملا، شکریہ۔ جوش کی تلاش نو کے عنوان سے قمر رئیس صاحب کا اداریہ خاص اہم ان معنوں میں ہے کہ مجلّے کی ضرورت کی نشاندہی ہی نہیں کرتا بلکہ مستقبل کے لئے جوش بیداری کی فضا کو تحلیل کرنے کے لئے رہنمائی بھی کرتا ہے۔ آپ حضرات نے عمدہ مواد یک جا کر لیا ہے اس میں مصطفےٰ زیدی کے مضمون نے انقلاب کے جس وسیع تصور کو سامنے رکھ کر جوش کے تصور انقلاب کو دیکھا ہے وہ اچھا ہے مگر فیضؔ کے آگے مضمون نے بھی اس پہلو کو بڑی ایمانداری سے گرفت میں لیا ہے۔

محمد علی صدیقی اور نامی انصاری صاحبان کی تحریریں بھی مفید مطالعہ ہیں۔ اقبال حیدر صاحب کی جوش سے عقیدت اور محبت کا تو یہ مجلّہ نتیجہ ہی ہے انھیں خصوصی مبارک باد۔

ہاں ایک بات اور یاد آئی سوال نامہ قائم کر کے آپ نے جو گفتگو چھاپی ہے وہ بھی خاصی کام کی ہے جس میں مختلف زاویہ ہائے نظر سے جوش کے فن اور معیار کا تعین ہی نہیں ہوتا بلکہ اردو کی شعریات بھی زیر بحث آجاتی ہے حالانکہ اختلافات کھل کر سامنے نہیں آئے ہیں، ابوالکلام قاسمی کے جوابات دلچسپ ہیں مگر مختصر۔

بہر حال جوش بانی دیکھ کر یہ خوشی ہوئی کہ جوش لٹریری سوسائٹی کو پرنٹ میڈیا کے لئے بھی ایک زبان میسر ہوگئی ہے۔ اسے سہ ماہی یا چھ ماہی کے عرصے میں قید کرنے کی ضرورت نہیں جب بھی لائق مطالعہ مواد میسر ہو جائے آپ اسے چھاپ سکتے ہیں۔ ایک بار پھر دلی مبارکباد۔

بھوپال اقبال مجید

☆

بہت پیارے فاطمی۔ خوش رہئے

تمہارا بے نظیر تحفۃ السرور جوش بانی کی صورت ذہن و دل کو گرما گیا۔

جوش کی بازیافت اور دریافت نو کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ یوں تو سبھی مضامین اپنی تخلیقی اُپج اور فکر انگیزی کی بنا پر جوش کی شخصیت و شاعری کو مرتکز کرتے ہیں لیکن مجھے خصوصی طور پر گفتگو کے عنوان سے شامل مذاکرہ زیادہ پسند آیا۔ غالباً 1966 اور 67 میں جوش ہندوستان آئے تھے قبلہ خواجہ احمد فاروقی نے ان کے اعزاز میں جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ جلسہ دلی یونیورسٹی کے ٹیگور ہال میں منعقد کیا گیا تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے راقم بھی اس جلسے میں شریک ہوا تھا۔ جوش نے اپنے کلام بلاغت نظام سے بھی طلباء کو سرفراز کیا تھا۔ جوش کی پزیرائی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے موفر اخبار اور جریدے بشمول انگریزی۔ ہندی ان کے انٹرویوز اور تصاویر سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جہاں جاتے ان کا پرتپاک خیر مقدم ہوتا۔ دلی میں وہ سیٹھ کشن لال جیسے محبّ اردو اور اپنے دیرینہ دوست کے مہمان خصوصی تھے۔ ممبئی میں ان کی ضیافت کے لیے پوری فلم انڈسٹری امڑ پڑی تھی۔ اردو کے ادبی حلقے انھیں سر آنکھوں پہ بٹھا رہے تھے۔

جوش اردو دنیا کے مقبول ترین شاعر تھے۔ ادھر آ کر ان کی شہرت کم ضرور ہوئی مگر ایسا بھی نہیں کہ انہیں کلی طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ معلوم حقائق کے اظہار سے ایک حد تک ہی گریز ممکن ہے۔ پاکستان جانا جوش کے لیے لہولہان روح بن گیا۔ ہندوستان میں ان کی عظمت کے چراغ روشن تھے ادبی و علمی حلقوں کے علاوہ سیاسی حلقوں میں بھی انہیں بے پناہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پنڈت نہرو۔ مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی ان کے عاشقوں میں سے تھے۔ پاکستانی ادباء وشعراء نے انہیں وہ تعظیم و تکریم نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ اردو کی پنجابی لابی نے نہ صرف انہیں نظر انداز کیا بلکہ دشنام طرازی سے بھی کام لیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی نے ساقی کا جوش مخالف نمبر نکال کر دل کے پھپھولے پھوڑے۔ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی نے ضرور جوش نمبر نکال کر اپنی ارادت مندی کا ثبوت دیا۔

مذاکرے میں جوش کے فیوڈرلزم کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ جہاں تک جوش کی شاعری اور اس کی روح کا تعلق ہے جوش اشترا کی نظریہ کے مقلد تھے جاگیردارانہ نظام کی وکالت انھوں نے کبھی نہ کی جوش کی شاعری و شخصیت عشق کا بلیغ اشارہ ہے اور عشق رسوم و قیود کا پابند نہیں ہوتا۔ روحانی درجات کی حصولیابی کے لیے بدن کو ہی سیڑھی بنایا جاتا ہے کہ بقا کے لیے فنا کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔

یوں بھی جس جذبہ کی تسکین سے انسان کی تطہیر ہوتی ہے۔ اگر جوش نے ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کیا تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ perverted تھے۔ حسن کے تئیں جوش کا رویہ قطعی غیر فطری نہیں تھا۔ وہ ذہنی وجسمانی اعتبار سے صحت مند انسان تھا۔ عورت کے حوالے سے جوش کو Male chauvinism کے منفی صیغے وابستہ کرنا بھی نادانیِ محض سوا کچھ بھی نہیں کیا یہ صحیح نہیں کہ Crudity میں عشق ہے فطری ہے وہ آرائش وزیبائش میں نہیں۔ عورت کی روشن دماغی اسے تصنع وبناوٹ کے سے مجبور کرتی ہے۔ وہ زندگی کے طے شدہ نظام کی اسیر ہوکر رہ جاتی ہے۔ حسن بے پروا اور حسن سادہ کی ایک الگ اپنی کشش ہوتی ہے۔

ہاں بھئی سوال وجواب والا کالم بھی دلچسپ ہے۔ مظہر امام، شارب ردولوی، سید محمد عقیل کے جوابات شائع ہیں۔

ایک بار پھر جوش بانی کی اشاعت کا استقبال کرتا ہوں۔

لکھنؤ　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　فیاض رفعت

☆

برادرم علی احمد فاطمی صاحب، آداب

آپ نے جوش بانی کی گراں قدر اور بامعنی سوغات کے ساتھ مجھے یاد کیا، یہ میرے لئے بے حد خوشی کا باعث ہوا، جوش جیسے عظیم المرتبت اور ہمہ گیر شاعر کے لئے غالبیات اور اقبالیات کی طرح جوشیات کا شعبہ ہمارے شعری ادب میں مناسب ہی نہیں ناگزیر بھی ہے یہ قابل استحسان امر ہے کہ جوش کو ان کے انتقال کے ربع صدی بعد از سر نو مختلف جہتوں اور زاویوں سے دیکھا جارہا ہے۔

جوش طالب علمی کے زمانے سے اب تک برابر میرے مطالعے میں رہے ہیں، اب تو جوش کی شاعری مجھے مختلف پیرایوں اور پہلوؤں سے متاثر کرتی ہے۔ فکر ودانش، رموز واسرار، شخصی ولا شخصی تجربات، معاشرت ومعاصرت، روایت وبدت، حسیات وکیفیات اور نہ جانے کتنے ہی علائق ومضمرات۔ لیکن طالب علمی کے ابتدائی مطالعات کے زمانے میں بھی شاید اسکول کے، آخری دو اک برسوں میں جوش کی منظر موسم اور کیفیت کی نظمیں۔ مجھے بے حد متاثر کرنے لگی تھیں۔ بلکہ کئی نظمیں

پوری کی پوری دل و دماغ اور حواس پر طاری ہو جاتی تھیں۔ اس حد تک کہ زندگی کے شب و روز اور منظروں کے بعض موڈس جوش کی نظموں ہی سے عبارت ہو کر رہ گئے تھے۔ اب بھی یہ کیفیت بعض اوقات پوری شدت کے ساتھ لوٹ آتی ہیں، خصوصاً ممبئی سے باہر چھوٹے شہروں اور قصبوں میں، یا سفر کے دوران، انہی دنوں ایک شعر ہوا تھا۔

اے جوشؔ تیری نظموں پر سازؔ کا دل صدقے
نظمیں ہیں کہ جینے کے سامان مہیا ہیں

جوشؔ بانی کافی دنوں تک استیعاب و انہماک کے ساتھ پڑھتا رہوں گا۔ یہ میرے نشاط مطالعہ کا سامان آپ نے فراہم کر دیا ہے۔ عرصے سے آپ سے ملاقات نہیں ہو پائی ہے آپ کا ممبئی آنے کا کوئی پروگرام ہے؟ محترم قمر رئیس صاحب سے سلام عرض کہئے۔ انہیں بھی خط لکھ رہا ہوں۔ احباب کو آداب و دعا۔

ممبئی

عبدالاحد سازؔ

☆

مکرمی تسلیم!

''جوشؔ بانی۔ا'' روبرو ہے۔ کسی ایک شاعر پر مکمل رسالہ شائع کرنا اور وہ بھی خاصا ضخیم سا۔ یقیناً بے حد محنت طلب کاوش ہے۔ اور پھر وہ شاعری جس کو فیشن کے طور پر نشانہ بنایا گیا ہو۔ ہر ایرا غیرا معتوب قرار دے رہا ہو اور جس نے خود اپنے لئے زندگی میں ہی میدان ادب میں کفن باندھ کر ڈٹے رہنے کی ٹھان لی ہو۔ خود کو مطعون کرنے کا سامان اکٹھا کر لیا ہو۔ ایسے شعری ہٹ دھرمی شاعر پر ایسے موسم میں جبکہ گوشوں اور نمبروں کے انبار لگ رہے ہوں۔ اچھے مضامین پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔

عبادت بریلوی کا مضمون اس میں شامل کیا گیا ہے۔ پڑھا تو نظریں جمتی ہی چلی گئیں۔ ظاہر ہے اس سے قبل نظر سے نہیں گزرا تھا۔ محمد علی صدیقی کی تو تقریباً ہر تحریر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مضمون بھی لاجواب ہے۔ اقبال حیدر کو ظاہر ہے جوش شناسی میں ملکہ حاصل ہے۔ ان کا مضمون ''بقدر ذوق نگاہ'' بے حد علمی معلوماتی اور منطقی ہے۔ اسلوب سنجیدہ اور باوقار ہے۔ جوشؔ کے معاملات

میں ان سے یہی توقع تھی ۔ڈاکٹر نفیس بانو، ڈاکٹر عزیزہ بانو بھی عبارت پڑھنے کو مجبور کرتی ہیں ۔ بلکہ دامن تھام لیتی ہیں ۔ ویسے بھی آجکل خواتین بہت اچھا لکھ رہی ہیں ۔اب رسائل نے تو ان کی تحریروں کو نظر انداز کرنا تقریباً چھوڑ سا دیا ہے، لیکن ناقدین حضرات ۔۔۔اف! بھلا کون سمجھائے انہیں ۔پھر وہ نیا پڑھتے بھی کتنا ہیں ۔اور کس کو ہیں ۔۔۔؟؟؟؟

بہر حال ''البیلی صبح'' کا تجزیہ سید محمد عقیل رضوی نے جس حسن ائی، نزاکت وصداقت اور خیال کی باریک بینی کے ساتھ جذبات کی نفسیاتی ندی میں نہاتے اور نہلاتے ہوئے، جسقدر بانکپن سے کیا ہے وہ انھیں کا خاصہ ہے ۔ دل چاہتا ہے اس ندی کی گہرائیوں میں سماتے ہی چلے جایئے ۔جتنی خوبصورت نرم ونازک نظم ہے ۔اسی قدر سبک ملائم تجزیہ بھی ہے ۔

دیگر مواد بھی بہتر ہے ۔آپ اور آپ کی ٹیم مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ہاں اگر کچھ تصاویر بھی شامل کر دی جاتیں تو جوشؔ سے وابستہ یادگاریں نئی نسل کی بینائی کو سیراب کرتیں!!

ثروت خان

اودے پور

☆

محترم ڈاکٹر علی احمد فاطمی صاحب

سلام ونیاز ۔امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ محترمی نعیم کوثر مدیر صدائے اردو کے توسط سے ''جوشؔ بانی ۔ا'' کے مطالعہ سے مستفیض ہوا۔آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اور ادبی رویوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے ۔یہ شمارہ بھی مشمولات اور ترتیب دونوں لحاظ سے وقیع ہے ۔ یہاں ماضی کے مناظر بھی ہیں اور حال کی تصویریں بھی ۔ خصوصی بات یہ ہے کہ جوش شناسی کے سلسلے میں جو مضامین یا سوالوں کے جوابات اس کتاب کی زینت ہیں اس میں منہ دیکھی والی بات کم ہی ہے اور کچھ لوگوں نے جوش پر بغیر کسی لاگ لپٹ کے گفتگو کی ہے ۔امید ہے کہ آئندہ شماروں میں کچھ نئے قلمکار بھی بغیر کسی ازم یا تحریک کی اوٹ لئے کھلے آسمان میں جوش کو دیکھنے کی کوشش کریں گے ۔

میں نے متذکرہ جریدہ پر ایک تعارفی مضمون سپرد قلم کر کے نعیم کوثر صاحب کو دیدیا ہے اس کی کاپی آپ کو ارسال کر رہا ہوں ۔

ضیا فاروقی

بھوپال

مکرمی فاطمی صاحب آداب

جوش بانی کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ اس شمارے میں کچھ پرانے اور مطبوعہ مضامین شائع کر کے آپ نے ایک اچھا کام کیا ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی تربیت ہوتی ہے۔ میں اقبال حیدر صاحب اور ان کے دوسرے رفقاء کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مصطفیٰ زیدی کا مضمون ''شبیر حسن خاں'' اور دوسرا عبادت بریلوی کا مضمون ''شاعر انقلاب'' دونوں قابل تعریف ہیں۔ دونوں حضرات جوشؔ صاحب کے قریب تھے۔ اسی لئے انھوں نے جوشؔ کی شاعری کے علاوہ ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ اور کئی مضامین قابل قدر ہیں۔ خاص طور سے سید محمد عقیل صاحب کا مضمون جوش کی نظم البیلی صبح کا عملی تجزیہ ہے۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد دوبارہ مطالعہ کرنے سے نئی فکر و سوچ کا موقع ملا۔ اقبال حیدر صاحب کا مضمون ''بقدر ذوق نگاہ'' بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں شاید کچھ غلط باتیں شائع ہوگئی ہیں۔ دراصل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کل ہند مصنفین کی کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس کی صدارت منشی پریم چند نے فرمائی تھی۔

سجاد ظہیر صاحب کی کتاب روشنائی میں اسکی تفصیل موجود ہے۔

اقبال حیدر صاحب نے انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ حالانکہ اردو میں بھی اظہار خیال مکمل طور سے ہوسکتا تھا۔ ''گفتگو'' اور ''سوال و جواب'' ان دونوں مضامین سے عظمت جوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان قابل قدر و احترام ادیبوں نے جوشؔ کی زندگی اور خاص طور سے شاعری کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ البتہ بات چیت کے دوران کچھ معیوب الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کا خاص وصف تھا کہ وہ گفتگو کے دوران دوسرے کے استعمال کئے گئے الفاظ و زبان پر توجہ دیتے تھے اور فوراً ٹوک دیتے تھے۔ اور کہتے تھے میاں اس لفظ کو ایسے نہیں اس طرح استعمال کیجئے۔

الہ آباد

اشفاق حسین

☆

مکرمی فاطمی صاحب،

آداب

قبلہ و کعبہ پروفیسر قمر رئیس کے تہنیتی جلسے سے لوٹا تو جوش بانی کو اپنا منتظر پایا۔ مشکور

ہوں۔ جوش کے سلسلے میں ایسے وقیع کام کا بیڑہ آپ جیسے فعال متحرک اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والے شخص کے ذریعے ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ اقبال حیدر جیسے مخلصین ہمراہ ہوں تو کیا کہنا۔ دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی دو دن میں انھیں بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ کل خاندان ادب دوست اور ادب مزاج ہے۔ اور ایسے ہی لوگ کچھ کر جاتے ہیں۔ جوش بانی میں آپ نے جوش کو سمجھنے اور ان کی شاعری کی قدر و قیمت سے واقف تمام بڑے ادباء کو اکٹھا کر لیا۔ مصطفٰے زیدی، عبادت بریلوی، محمد علی صدیقی، نامی انصاری اور اقبال حیدر سب کی تحریریں ہر اعتبار سے جوش شناسی کے سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

جوش کی نظم البیلی صبح کا تجزیہ عقیل صاحب نے بڑے معروضی انداز میں کیا ہے۔ اب رہا معاملہ یہ کہ جوش اقبال کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں یا نہیں تو میں صد فیصد اتفاق رکھتا ہوں کہ جوش بلاشبہ اقبال کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ علامہ اقبال اپنی فکر کے ذریعہ اردو شاعروں کے لئے جو راہیں متعین کر گئے تھے ان سے گریز ہر کسی کے بس کا روگ نہیں تھا یہ جوش جیسے مضبوط ذہن و فکر والی شخصیت کا کمال تھا کہ انھوں نے اس میں اپنی الگ فکری دنیا آباد کی۔ ورنہ اس عہد کے بیشتر شعراء کا کلام اٹھا کر دیکھ لیجئے اقبال سب کے مزاجوں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ حتیٰ کہ بیشتر شعراء کے مجموعوں کے نام بھی کلام اقبال سے مستعار ہیں۔ تنہا جوش ہیں جنھوں نے ہندوستان کی روح کو اس کی آتما کو اس کی ہزاروں سال کی تہذیبی فکر کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا ہے۔ ن م راشد، میرا ں جی یقیناً اہم شاعر ہیں مگر جوش کی قد کاٹھی کا ان میں کوئی نہیں۔ جوش سے راہ شوق میں بس ایک غلط قدم نہ اٹھا ہوتا تو آج سب مخالفین کے منھ خود ہی بند ہو گئے تھے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ تمام تعصبات، نظریاتی اختلافات اور تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر کیا جائے تا کہ ایک بڑے شاعر کو اس کا مقام مل سکے۔ جوش بانی نے اس سلسلے کا آغاز کر دیا ہے۔ میں جوش بانی کی اشاعت پر آپ کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

فاروق بخشی

کوٹہ

☆

مکرمی، سلام سنون

آپ تمام حضرات کو جوش بانی کے کامیاب اشاعتی سلسلہ کے قیام پر بہت بہت مبارکباد۔ آپ نے جوش پر ایک عملی اور علمی جریدہ نکال کر کس قدر ادبی ثواب کا کام کیا ہے۔ اس کا اجر اردو والوں کی طرف سے (جو ممکن تو نہیں) ضرور ملنا چاہیئے۔ اس سلسلہ سے جوش واقعی غالب، اقبال کی بعد کی صف میں آ گئے ہیں اور اس طرح کے کاموں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بکھرے ہوئے تمام مباحث ایک جگہ پر آ جاتے ہیں دوسرا یہ کہ وہی ادیب و شاعر نہیں بلکہ پورا عہد متاخرین و متقدمین بھی معرض بحث میں رہتے ہیں۔

جوش بڑے شاعر ہیں یا نہیں یہ میرا مسئلہ نہیں، لیکن میں اس بات کا واقعی مدعی ہوں کہ اردو شعری ادب کی مختصر ترین فہرست بھی جوش کو فراموش نہیں کر سکتی۔ جوش ان فنکاروں میں سے ہیں جن پر معروضی انداز سے غور کرنے کے بجائے عقیدت مندانہ تحریریں زیادہ لکھی گئیں۔ یا ان کی شخصی اور ادبی خدمات سے صرف نظر کی کوشش کی گئی اور دونوں انداز کسی بھی تخلیق کار کے لیے سم قاتل ہیں۔ جوش بانی کے پہلے شمارہ سے ہی ثابت ہو گیا کہ ہر نقطہ نظر کو اہمیت دی جائے گی۔ (اگر عقیدت مندانہ رسالہ نکالا جاتا تو نامی انصاری اور ''سوال و جواب'' کے مباحث شامل نہیں ہو سکتے تھے) ''مرزا دبیر'' کی طرح جوش بھی تنقید کے مظالم کا کم شکار نہیں ہوئے اور یہ تنقیدی مظالم کا رویہ تقلید پسند ذہنیت اور بت پرستی کے عوض ہمارے یہاں پیدا ہوا ہے۔ علامہ شبلی کی رائے کو کون چیلنج کر سکتا ہے خواہ وہ کتنی بھی ڈنڈی مارتے رہے ہوں۔ (خدا بھلا کرے ڈاکٹر زماں آزردہ اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کا) ایسا ہی کچھ اب تک جوش بھی بھگتتے رہے۔ ہمارے جغادری نقاد چند شخصی باسی آرا کے (جو قطعی تنقیدی آرا نہیں کہیں جا سکتیں) خوانچوں پر الفاظ کے چاندی کے ورق لگا کر تازہ مال کی صورت میں بیچنے کے فراق میں رہتے ہیں اور بزعم خود۔۔۔شناس بنے پھرتے ہیں۔

جوش بانی کے پہلے شمارہ سے ہی بہتر آثار نمایاں ہونے لگے ہیں کہ جوش کے تعلق سے خاصی بہتر تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ ورنہ عام طور سے جوش نمبروں میں چند گھسی پٹی تحریریں ہی نظر آتی تھیں۔ ''گفتگو'' کے مباحث نے تو پوری شاعری کو نئے حوالوں سے دیکھنے کی گنجائش پیدا کر دی ہے۔ اب تو یوں بھی متن کے خود مکتفی ہونے پر اصرار ہے۔ اس حوالے سے جوش کے متن پر نئے

سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ''گفتگو'' اور ''سوال و جواب'' کا سلسلہ آئندہ بھی برقرار رہے تو لطف باقی رہے گا۔

آخر میں ضروری بات یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہمارے یہاں خودنوشت سوانح کا ایک روگ سا پھیل (جسے وبا کہیں تو بہتر ہے) گیا ہے۔ جسے بڑے بڑے دعووں کے باوجود دروغ گوئی کی شیرازہ بندی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن غالب، میر، اقبال، انیس کے علاوہ شاید ہی کسی کی سوانح کو مرتب کرنے یا لکھنے کی توجہ کی گئی ہے۔ جوش ان شاعروں میں سے ہیں جن کی سوانح پر کام ہونا چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال حیدر صاحب اس کام کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں (اللہ ان کو صحت اور طویل عمر دے)۔ دوسرے یہ کہ جوش کی نثری تحریریں بھی شائع کرتے رہیے، ان سے جوش کی شاعری اور تصور ادب کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔

آپ تمام حضرات کو ایک بار پھر بہت بہت مبارکباد۔

خان احمد فاروق

کانپور

محترم ایڈیٹر

جوش بانی کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔ کچھ دنوں سے الہ آباد میں کوئی معیاری رسالہ نہیں نکل رہا تھا جس کی کمی سخت محسوس ہو رہی تھی کہ جوش بانی نے سامان تسکین فراہم کیا۔ میں رسالے کے مدیر، معاونین و مرتبین کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس شمارے میں جوش کی نظم ''البیلی صبح'' پر سید محمد عقیل رضوی کا عملی تجزیہ نظم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر نفیس بانو اور ڈاکٹر عزیز بانو کا مضمون بھی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے جوش کی شاعری کے کچھ خاص زاویوں کو پیش کیا۔ شاداب قدیر کا مضمون پسند آیا کہ انہوں نے جوش کو فیض کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔ اقبال حیدر صاحب کا مضمون قابل غور و فکر ہے کہ انھوں نے جوش فہمی کے مسائل اور جوش کی ناگزیریت پر بڑی جامع اور سچی باتیں کہی ہیں۔ ساتھ ہی عصر حاضر کے ادیبوں اور ادب پر بھی وار کیا۔ رسالے کا ایک اہم جز ''گفتگو'' بھی ہے جس میں ادیبوں نے جوش کی اہمیت وافادیت پر سیر حاصل گفتگو کر کے قاری کو دعوت فکر دی ہے۔ فاطمی صاحب کا سوال بہت اہم ہے کہ آج ہم جوش کو کیوں پڑھیں؟ مجھے ناہید

صاحبہ اور شائستہ صاحبہ کی بے لاگ گفتگو خاصی پسند آئی جب انھوں نے جوش کے نظریہ نسوانیت پر بات کرتے ہوئے بڑی بے باکی سے ایک سچی بات کہہ دی کہ جوش نے عورت پر شک بھی کیا اور ننگا بھی۔

یقین ہے کہ یہ رسالہ جوش فہمی کے نئے سلسلوں کو آگے بڑھائے گا۔

الہ آباد — نغمہ جائسی

☆

محترم جناب علی احمد فاطمی صاحب

روز بروز بڑھتی ہوئی شعراء وادباء کی تعداد اور نئے نئے رسائل کی اشاعت جتنی باعث طمانیت ہے اتنی ہی باعث فکر بھی اس لئے معیار کی کمی اور روایت سے بغاوت اکثر و بیشتر تشویش پیدا کرتی ہے باوجود اس کے ۲۱ ویں صدی کی ابتدا میں ایک مکمل معتبر ادبی اور معیاری رسالہ کے اجراء پر مدیر ''جوش بانی'' کو مبارکباد!

اس شمارے کے تمام مشمولات قابل ستائش ہیں خصوصاً نظم ''البیلی صبح'' کا تجزیہ جسے استاد محترم پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق مدلل اور مبسوط بنا کر پیش کیا ہے۔ تحریر کا انداز ایسا کہ کلاس روم (Class Room) کی یاد تازہ ہوگئی انہیں ماہر اقبالیات کے ساتھ ساتھ ماہر جوشیات کہنے میں کوئی تامل نہیں۔ اللہ ان کا سایہ تادیر باقی رکھے۔ آمین۔ جوش پر قمر رئیس، اقبال حیدر، عباس زیدی، شائستہ رضوی، ناہید کاظمی، عرفان حیدر اور علی احمد فاطمی صاحب جیسے دنشوران حضرات کی علمی وادبی بحث میں جوش سے متعلق کئی ایسی چیزیں نکل کر آتی ہیں جس سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فاطمی صاحب کے Compering کا انداز نرالا ہے۔ سوال وجواب کے باب میں استاد محترم عقیل رضوی صاحب اور شارب ردولوی صاحب کے جوابات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ناچیز کی رائے میں اس رسالے کا سب سے اہم باب سوال وجواب ہی ہے جس کے ذریعہ شمارے کی نوعیت دستاویزی ہوگئی ہے ''جوش، فیض کی نظر میں'' جناب شاداب قدیر صاحب کا نہایت فکر انگیز مضمون ہے۔ فکر انگیز اس Sense میں کہ مضمون کی ابتدا میں ہی صاحب مقالہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ''اس مقالے میں جوش کے مرتبے کا تعین کرنا مقصود نہیں ہے

اور نہ ہی ان کے کلام کا فکری وفنی سطح پر جائزہ لینا بلکہ جوش کی قدر و قیمت فیض کی نظر میں کیا ہے یہ مقالہ اس موضوع کا احاطہ کرتا ہے' باوجود اس اعتراف کے مقالہ نگار فنی تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں اور تو اور آگے لکھتے ہیں '' یہ بات صحیح ہے کہ جوش کے یہاں الفاظ ایک ایسا ذخیرہ ہے جو دوسرے شعراء کے یہاں نہیں آتا۔ لیکن ہم جوش کی شاعری کو محض لفاظی کہہ کر رد کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کثرت الفاظ کی وجہ سے ان کے یہاں ایسے بھی مقامات آئے ہیں جہاں وہ لفظوں کے استعمال پر محتاط نظر نہیں آتے ہیں''۔ میری ناقص رائے میں یہ فیض نہیں بلکہ مقالہ نگار بول رہا ہے اور جب اتنی اہم رائے اس نے جوش کے سلسلے میں قائم کی ہے تو کیا اچھا ہوتا کہ اس ضمن میں چند اشعار بھی پیش کر دیتے شاید ہم جیسے کم علم لوگوں کو بھی کچھ پل کے لئے جوش کی شاعری محض لفاظی محسوس ہوتی۔ آخر میں ''جوش بانی'' کے اسٹائل اور گیٹ اپ کے سلسلے میں جوش کی نظم ''البیلی صبح'' کا ایک مصرعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے

الہ آباد — محمد کاشف

فاطمی صاحب!

جوش بانی پہلے شمارے کے لحاظ سے بہت اچھا آیا ہے مگر ایک جریدے کو دستاویز بننے میں جو وقت، معیار پسندی اور مصروافیات درکار ہوتی ہے وہ آتے آتے آئیگی۔ تین چیزیں بہت زیادہ توجہ طلب ہیں وہ باقاعدہ سیلکشن کا طریقہء کار، پروف ریڈنگ اور سرورق کا انتخاب ہے اور ان تینوں چیزوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ایک قدر مشترک ہے جس کو ہمارے یہاں Time Managment کہتے ہیں۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ جو چیز منتخب کرلی جائیں ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ فوراً کر کے تیار شدہ چیزوں کے ڈبے یا بکس میں محفوظ کرلیا جائے تا کہ شمارہ نکلنے سے فوراً پہلے جو اسا دا کام آپا دھاپی میں کرنا پڑتا ہے وہ نہ کرنا پڑے۔ رسالہ کی ضخامت کے لحاظ سے اگر انتخاب قبل از وقت مکمل نہ کیا گیا تو بھی شاید کچھ چیزیں خانہ پری کے لیے شامل کرنی پڑ جائیں۔ اسی طرح سرورق کے لیے آرٹ ورک یا اسکیچ پہلے سے بنالینا بھی بہت ضروری ہے ورنہ

عجلت میں کمپیوٹر کی مدد سے Make Shift کوئی چیز بنانی پڑے گی۔ سرورق اور مجموعی طباعت ایسی ہونی چاہئے کہ جریدہ سنجیدہ جگہ پانے میں کامیاب ہو اور اس کی ایک صوری کشش بھی ہو۔ میرے خیال میں تو تین سے چار سو ورق ہر وقت دستیاب ہونے چاہئے جن میں سے انتخاب کیا جائے۔ جن لوگوں نے اب تک جوش بانی دیکھا ہے پسند کیا ہے سراہا ہے لیکن پروف کی شکایت بھی کی ہے۔ غرض یہ کہ تمام کا مجستہ جستہ مکمل کرلینا، اور اشاعت کے وقت یکجا کردینا ہی وضع خاص ہے۔۔۔۔۔

ایک اور بات۔۔۔۔۔ میں جوش بانی یا کسی بھی تخلیقی کام کے بارے میں اپنے رول کو کسی انتظامی یا مالی حیثیت میں نہ دیکھتا ہوں نہ پسند کرتا ہوں۔ مجھے اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اپنی صلاحیتوں کا تھوڑا بہت ادراک ہے۔ میں فکر و دانش کے محاذ پر اپنا نذرانہ (Contribution) پیش کرنا چاہتا ہوں یا پیش کرنا جانتا ہوں۔ میں جس فکری سخت گیری کا قائل ہوں اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میں ذہنوں کو کریدتا رہوں شاید اپنی بساط بھر کوشش بھی کرتا ہوں۔ اس تمام تر گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اگر چار پیسے مجھے صرف اس لیے مل گئے کہ میں بہت ہی نوجوانی میں کنیڈا آ گیا اور ان کی قدر شرح مبادلہ کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان میں بڑھ جاتی ہے تو اس کو ہم نعمت مشترکہ کے طور پر استعمال کریں گے۔ اسی طرح جو ہم میں فدائی ہم آہنگی اور توانائی ہے اس کو بھی ہم مشترک توانائی کی طرح استعمال کریں گے۔ یہ رسالہ یا آئندہ جو بھی پروجیکٹ جو ہم ساتھ کریں گے وہ انہیں خطوط پر استوار ہوگا اور اس ہنر میں بلا شرکت غیرے آپ اور میں شامل ہیں۔ اسی طرح جوش بانی کو لے کر یا ہمارے دیگر پروگرام کو دیکھتے ہوئے ہمیں بلا شرکت غیرے اس کو انتہائی خوش اسلوبی اور معیار بندی کے ساتھ نبھانا ہے۔

کیلگری۔ کینڈا

اقبال حیدر

☆☆☆

محمد عبدالقدیر

جوش کی بازیافت
بہ حوالہ ''جوش بانی''
تجزیہ وتبصرہ

پس منظر

یہ خوش آئند بات ہے کہ اردو زبان کو ایسے شیدائی میسر ہیں کہ جو اپنی اردودانی کو ذریعۂ آمدنی نہیں بناتے ہیں بلکہ اپنے قیمتی وقت اور گاڑھی کمائی کا قابل قدر حصہ اردو کی توسیع وترویج پر صرف کرتے ہیں۔ اسی قبیل کے کنیڈا کے شہر کیلگری میں سکونت پزیر شاعر و ادیب اقبال حیدر ہیں جو گذشتہ دنوں شہر الہ آباد تشریف لائے تھے۔ ان کے اعزاز میں فراق وجوش اکیڈمی کے بینر تلے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں انھیں استقبالیہ دیا گیا بعدہٗ ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں کچھ مقامی شعرا کے علاوہ مہمان مذکورہ اور دہلی سے تشریف لائے شاہد ماہولی (ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ)، ایڈوکیٹ عبیدالرحمن ہنر نے بھی کلام پیش کیا۔

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ان کا تعارف پیش کیا اور بتلایا کہ اقبال حیدر کے والدین کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال حیدر ایک عرصہ سے جوش کے حوالے سے گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اقبال حیدر نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ابھی تک جوش کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے، ہماری کوشش ہے کہ ان کی تہذیبی روایت کے سرمایہ کی حفاظت کریں اور ان کے مقام کو بحال کریں۔ ہندوستان میں تو گاڑی کافی حد تک پٹری پر آ گئی ہے مگر پاکستان میں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ انھوں نے جس لگاؤ Commitment سے اپنے جذبہ (Passion) کا اظہار کیا اس میں مشنری روح کارفرما محسوس ہوئی۔ ان کے اس کارواں میں ان کی اہلیہ اور بہنیں شائستہ رضوی وناہید کاظمی بھی شریک وموجود تھیں۔ یعنی ایں خانہ ہمہ آفتاب است

کی مصداق۔

چند دنوں بعد پروفیسر فاطمی نے ''جوش بانی'' کتابی سلسلہ کا پہلا شمارہ عنایت کیا جو بہت پیارہ اور دیدہ زیب ہے۔ میں یہ سمجھا کہ ایک ترقی پسند شاعر (جوش) اور ایک تجدد پسند شاعر (منچند ابانی) کو ایک عنوان پر جمع کر کے معاصر ادب کے مطالعہ کا نیا منصوبہ ہوگا جس سے نئی سمت سفر کھلے گی جو ہم جیسے کم مایہ طالب علموں کے لئے بڑی کار آمد بات ہوگی۔ مگر جب ہم نے اس کا مطالعہ کیا تو اپنی خوش گمانی پر افسوس ہوا اور عقدہ کھلا کہ بانی سنسکرت کے لفظ वाणी کا اردو کرن ہے۔ عام ہندوستانی بول چال میں یہ لفظ کسی مذہبی رہنما، گرو یا سنت وغیرہ کے اپدیشوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے مثلاً گرو بانی، سنت بانی، کبیر بانی، میرا بانی وغیرہ۔ لہٰذا ہم یہ سمجھے کہ معتقدین جوش، ان کے اقوال کا ورد و وظیفہ کریں گے اور جوش کی بانی کا پرچار و پرسار بھی۔ لیکن پتہ چلا کہ ہم پھر غلطی پر تھے اور بالآخر اصل مدعا مرتب گرامی کے اس قول سے واضح ہوا۔

> ''جوش بیزاری یا بے اعتنائی کی فضا کو تحلیل کرنا ہے
> جو سرحد کے دونوں جانب دیکھی جاتی ہے اور اس طرح جوش کے
> حقیقی منصب کی تلاش و تعبیر کر کے آہستہ آہستہ اسے اس طرح قائم
> کرنا ہے کہ جوش ہی نہیں بیسویں صدی کے ادب کے ساتھ انصاف
> ہو سکے۔''

جب ہم اور گہرائی پر اترے تو معلوم ہوا کہ برس دو برس پہلے جب پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر علی احمد فاطمی کیلگری تشریف لے گئے تھے تو اس تحریک کی داغ بیل اقبال حیدر کی تجویز پر وہیں پڑی تھی۔ لیکن ہمارے شہر کی خوش قسمتی کہ مجلّہ کے اشاعت کی سعادت اور نصف ادارت اسے ملی ہے۔ جہاں اس میں ربع صدی پہلے کے مضامین بھی شریک اشاعت ہیں وہیں دوسری خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے شہر کی نمائندگی خاطر خواہ ہے۔ جس میں چند ابھرتی ہوئی ادیباؤں ڈاکٹر نفیس بانو، ڈاکٹر عزیزہ بانو اور ڈاکٹر بننے کی قطار میں

کھڑی نعیم السحر صدیقی کو بھی جگہ دی گئی ہے۔اس شمارے میں نامی انصاری کا مضمون نہایت جامع اور متوازن ہے۔ مصطفیٰ زیدی، محمد علی صدیقی اور شاداب قدیر نے بھی اپنے عنوان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ہلال نقوی نے اپنی تحقیق کے جوہر دکھائے ہیں اور جوش کی تاریخ پیدائش کا صحیح تعین کیا ہے۔ ہمارے بزرگ نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے "البیلی صبح" کے ۹ اشعار پر ۱۰ صفحات کی تحریر میں عملی تنقید کی ماسٹری دکھائی ہے۔ عبادت بریلوی کا مضمون جوش کے مزاج اور شخصیت کو سمجھنے کا ایک نیا دریچہ کھولتا ہے۔ لیکن ۳۶ صفحات کے اس مضمون کا اس کے عنوان سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جوش کو شاعر انقلاب کہنا شاید ان کے تخاطب کا حصہ ہے لیکن ایک بلیغ جملہ وہ ضرور فرما گئے۔

"ان کے یہاں انقلاب کا تصور اگرچہ رومانی اور تخئیلی ہے لیکن اس کے باوجود تمام تر انسانی محبت اور ہمدردی سے معمور ہے۔"

مجلّہ کے صفحہ ۲۱۳ پر جو نکات عباس زیدی کے حوالے سے مرقوم ہیں وہی صفحہ ۲۱۸ پر قمر رئیس سے منسوب ہیں، شاید یہ طباعت کا سہو ہے۔ مگر ہم پر سب سے بھاری گزری وہ گفتگو جو قمر رئیس، اقبال حیدر، عباس زیدی، شائستہ رضوی، ناہید کاظمی، عرفان حیدر اور گفتگو کار علی احمد فاطمی کے ارشادات پر مبنی ہے۔ اگر ہم سے گنتی میں غلطی نہیں ہوئی تو خدا جھوٹ نہ بلوائے یہ پورے ۳۹ صفحات پر پھیلی ہے۔ اتنے صفحات میں تو جوش پر ایک گراں قدر مقالہ سما سکتا تھا۔ ہم گفتگو میں نتیجہ خیزی کے قائل ہیں کہ وہ ہمیں کسی مثبت انجام تک پہنچائے۔ ادبی گفتگو کو چاہئے کہ وہ خلاف و موافق نکات پر بحث کے بعد Points of agreement and disagreement پر منتج ہو اور پھر تحلیل و تعبیر کے ساتھ اس کا ماحصل قاری کو منتقل کر دے اور وہ اس سے مقصد قرات یا مطالعہ پالے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ہم مزید کچھ نہ کہہ کر قاری پر فیصلہ چھوڑتے ہیں کہ اسے اس گفتگو سے برآمد کیا ہوا۔

آخر میں Loosely written چند سوالات شامل ہیں جن کو اور مختصر اور جامع طور پر Frame کیا جا سکتا تھا۔ اس کے جوابات سے ہم نے یہ جواہر پارے اخذ کئے ہیں۔

اقوال زریں

۱۔ جوش کی شاعری محسوسات کے تجسیم کے ذکر کی شاعری ہے جس میں ان کا حریف نہ اردو میں ہے نہ ساری دنیا میں۔۔۔ وہ خدا اور مولوی کے جھگڑے میں نہ پڑتے تو ان کے یہاں بصیرت کا امکان تھا۔ (مصطفےٰ زیدی)

۲۔ جوش فلسفی نہیں ہیں ان کے خیالات میں گہرائی نہیں ہے اس وجہ سے کہیں کہیں تضاد ہے۔ (عبادت بریلوی)

۳۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ جوش اس صدی کے اقبال کے بعد بڑے شاعر ہیں۔
(نامی انصاری)

۴۔ اس حقیقت سے چشم پوشی ناممکن ہے کہ جوش اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں۔ (شاداب قدیر)

۵۔ جوش کی شاعری تحریک آزادی کے خلفشاری دور کا کارڈ ہے۔ خرابیوں کے باوجود ان کی تخلیقات سے کوئی صرف نظر نہیں کرسکتا۔ (سید محمد عقیل)

۶۔ غالب کا انتخاب بھی کمزوریوں سے خالی نہیں، جوش کی شاعری میں بھی کمزور پہلو ہیں۔ (شارب ردولوی)

جوش پر تنقید کی منزل

ماہرین جوش کی آرا سے تنقید جوش کی منزل کا سراغ اس طرح ملا کہ:

۱۔ ہندوستان اور پاکستان میں جوش بیزاری پائی جاتی ہے۔

۲۔ ۲۵۔۵۰ سالوں سے جوش کے ساتھ معاندانہ روش رکھی گئی ہے مگر اب احیاء ہورہا ہے۔ (اقبال حیدر)

۳۔ ان کی شاعری کو وقت کے تقاضوں سے مربوط کرکے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے کلام کا انتخاب ~~کسے جو~~ کم سے کم تین صاحب رائے حضرات کریں جو رسمی نہ ہو غور وفکر کے بعد ہو۔ (مظہر امام)

۴۔ ابھی جوش کی شاعری کا کما حقہٗ محاسبہ نہیں کیا گیا۔۔۔ (شارب ردولوی)

۵۔ جوش کی شاعری جس توجہ علمی سے تجزیے اور تعبیر کا مطالبہ کرتی ہے وہ ابھی سامنے نہیں آیا۔ (شاداب قدیر)

۶۔ ترقی پسند تنقید کی ذمہ داری تھی کہ ان کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کرتی۔ (ابوالکلام قاسمی)

جوش کی تلاش نو

ادب میں یہ بات بھی شد و مد سے کہی جاتی ہے کہ بسا اوقات ایک اچھا شاعر یا ادیب معاصر کی عدم توجہی یا تعصب کے باعث اپنے دور میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ گمنامی کے غار سے نکل کر مقبولیت کو چل نکلتا ہے۔ اسے اس کی نئی دریافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی کلیہ Rule نہیں ہے بلکہ محض استثنیٰ Exeception ہے۔ اس کے لئے اکثر غالب یا نظیر کی مثال دی جاتی ہے آیئے ان دونوں کے حوالے سے اس دعویٰ پر غور کریں۔

جہاں تک غالب کا تعلق ہے اس دور میں معیار تخلیق کچھ اور تھا، دربار کے استاد کا طوطی بولتا تھا۔ شاعری جذبہ کے اظہار اور انداز بیان کے گھیرے سے باہر نہیں نکل پائی تھی۔ غالب کی شاعری میں عظمت کے سبھی نشان تھے لیکن ماحول ابھی فکر و تعقل اور حرکت کے تئیں عالم بلوغت کا منتظر تھا۔ جیسے ہی دھند چھٹی روشنی نظر آنے لگی۔ غالب کی تازہ کاری میں کند نہ ہونے کی سکت ہے تو وہ مقبول ہوئی اور آئندہ رہنے کے تمام تر امکان ہیں۔ اس کے برخلاف نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی عوامی مقبولیت اس کے دور میں تھی یہاں تک کہ فورٹ ولیم کالج میں ہندستانی زبان و تہذیب کے مطالعہ کے لئے جو عہدے داران آئے ان میں سے کچھ نے واپس انگلینڈ جا کر نظیر کو ہندستان کا شیکسپیئر بہ معنی مقبولیت گردانا۔ پھر محمد حسین آزاد نے عوامی شاعری کو ساقط المعیار قرار دیا جس سے ابھی تک اردو تنقید ابھر نہیں پائی۔ جب ترقی پسند تحریک نے ادب کو عوام اور عوامی مسائل کے تناظر میں دیکھنا شروع کیا تو چونکہ

ان کے مطلوبہ عناصر نظیر کی شاعری میں وافر تھے لہٰذا انھوں نے نظیر کو کاندھوں پر اٹھالیا اسی طرح وہ اقبال میں بھی ان عناصر کی تلاش کرنے لگے۔ اس سے ذکر نظیر تو چھڑا، معنویت کی تلاش ہوئی مگر میزان تنقید پر ان کا وزن کتنا بڑھا یہ اب بھی جواب طلب سوال ہے۔

اب ہمیں ان وجوہات کی تلاش کرنا ہوگی جن کے باعث معاصر تنقید نے جوش کو نظر انداز کیا۔ پھر ان کی شاعری میں ان عناصر کی نشاندہی کرنا ہوگی جن کی مناسبت دور حاضر کی معنویت سے ہو۔ اگر ان کی شاعری میں زبان، انداز بیان، فکر و فلسفہ ایسا ہے جسے آج کا قاری پڑھنے کا شائق ہے، آج کا شاعر ان کا تتبع کرنے کا متمنی ہے تو چند لوگوں کے تعصب سے جوش کا کچھ نہیں بگڑنے کا۔ آپ دوسروں کو چھوڑ دیں کیا جوش، مجروح سلطانپوری، معین احسن جذبی، وامق جونپوری خود ترقی پسند تنقید کے شاکی نہیں تھے۔ اگر کسی کی روش معاندانہ تھی تو ترقی پسند نقادوں نے جوش کو کیوں اس مقام پر متمکن Establish کیوں نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ چند سیمیناروں میں وہ مقالات (جو نہ دل جمعی سے پڑھے جاتے ہیں نہ توجہ سے سنے جاتے ہیں) پیش کر کے ہم نہ کسی کو چھوٹا بنا سکتے ہیں نہ بڑا۔ شاعر یا ادیب کو جگہ اس کی تخلیق ہی دلوا سکتی ہے۔ اگر اس میں دم خم ہے۔

جوش کا معاملہ اکبر الہ آبادی کی مثال سے یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی اپنے اسلوب کے بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔ اپنی صنف میں وہ سب سے آگے ہیں مگر ان کی مجموعی حیثیت کو ابھی وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ متقاضی تھی۔ ہر چند کہ ان کی شاعری کی آج بھی وہی معنویت ہے، اس میں وہی دلچسپی ہے۔ اسی طرح جوش بھی اپنے اسلوب کے بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔ آج نہ وہ شاعری کوئی کر رہا ہے اور نہ کر سکتا ہے جو جوش کر گئے مگر نئی نسل میں ان کی پسندیدگی کی وہ فضا پیدا نہیں ہوئی جو ان کی ہمعصروں میں تھی۔ آہنگ صوتی Alliteration جو انگریزی شاعری میں وکٹورین ایج میں بہت مقبول تھا یعنی اگر نغمہ کا بیان ہے تو ایسے الفاظ کا استعمال کریں جن کا تلفظ ہی نغمہ پیدا کر دے۔ جنگ و جدل کا بیان ہو تو لگے الفاظ خود لڑ رہے ہیں لیکن انگریزی رومانی شاعری کے

ارتقا کے بعد اس صنف کی پسندیدگی میں زوال آیا۔ جوش اس فن کے مشاق ہیں ان کا یہ مصرع ملاحظہ کیجئے کہ ع وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

ضرب المثل ضرور بن گیا ہے مگر ذرا اس کے اوپر کے اشعار کے بارے میں نئی نسل سے پوچھ لیجئے کہ وہ کیا اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں جس طرح گزرتی ہوئی نسل کے لوگ؟ تو جواب نفی میں ہوگا۔

لہٰذا اگر ہم جوش کو عظیم شاعر منوانا چاہتے ہیں تو یہ کام محض عقیدت وارادت سے نہیں ہوگا۔ ہم کو چاہئے کہ ہم عالمی شاعری یا کم از کم اردو شاعری میں جو عظیم شاعری کے مصدقہ عناصر ہیں ان کو پیش کریں اور پھر دلائل رکھیں کہ جوش کی شاعری میں یہ عناصر دیکھئے فلاں فلاں جگہ ہیں۔ تب ہر ذی شعور اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا اور اگر ہم عظمت کے وہ عوامل پیش نہ کریں اور کوئی ان کی شاعری کو بچکانہ شاعری کہہ دے اور ہم اس میں بدک جائیں اور جواباً کہیں کہ کہنے والا خود طفل مکتب ہے تو کیا اس سے جوش کا مقدمہ خراب نہ ہوگا؟ اس سے ہم صرف یہ کہہ کر محل نظر نہیں کر سکتے کہ یہ روش معاندانہ کا نتیجہ محض ہے۔ بیشتر شعرا کے یہاں ایک معیار قائم نہیں رہتا۔ بلند و پست دونوں مقامات رہتے ہیں الگ موڈ ہوتا ہے، الگ ماحول۔ ہمیں یہ تسلیم کرتے ہوئے وہ تخلیقات پیش کرنا چاہئے جو ان کی نمائندہ تخلیقات ہیں، ان کے حوالہ سے ان کے مقام کا تعین کرنے کی سعی کرنی چاہئے۔ ہر رطب یابس کی مدافعت نہیں۔

اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ ''جوش کی شاعری بچکانہ ہے'' اس کا اثبات ونفی میں جواب دو تو میں جوش کی شاعری سے دسیوں مثالیں ایسی پیش کرسکتا ہوں جس میں شاعر کی طفلانہ مزاجی، ناپختہ ذہن کی فکر، کھلنڈرانہ پن، کھاؤ پیو اور جیو eat, drink and be merry کا مزاج کارفرما ہے اور اگر اس قول کی نفی کے لئے کہا جائے تو ان کی شاعری سے دسیوں مثالیں ایسی پیش کروں گا جن میں پختہ ذہنی، بالغ نظری اور فکر و فلسفہ کی رنگارنگی جھلک رہی ہوگی۔ ان کی شاعری انسان دوستی، دردمندی، جرائت، بغاوت سے مملو ہے۔

ان کی نظم کا آہنگ ،شوکت الفاظ،اس کا طنطنہ بے مثل ہے۔ہمیں ان کے شعری محاسن کو منتخب طور پر پیش کرنا ہوگا۔ان کی غزل کی ایمائیت ،رمزیت ،اشاریت کے حوالے سے،ان کے مراثی کے حوالہ سے،ان کی رباعیات کے حوالے سے خراب موضوعات پر ان کی اچھی نثر کے حوالہ سے انہیں اجاگر کر کے اس میں عصری معنویت کی تلاش وتعبیر کرنا ہوگی ۔اس میں ترقی پسند تنقید (ہر چند کہ میں ادب کو ذاتی طور پر خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں ہوں لیکن عارضی طور پر پہچان کے لئے یہ اصطلاح استعمال کر رہا ہوں) کی ذمہ داری تھی کہ وہ جوش کی شعریات کی چھان پھٹک کرتی اور وہ تھوتھا الگ کر دیتی جو وقتی ضرورت کے پیش نظر کمیونزم کی ائیڈیالاجی یا پروپگینڈے کی ترجمان تھی اور ان کی شاعری کے اس حصہ کو منتخب کر کے نمائندہ کلام کے طور پر پیش کرتی جس میں اچھی شاعری کے لوازمات وعناصر نمایاں تھے۔ لہٰذا اس تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مجلّہ کو دہائیوں پہلے لکھے گئے ان مضامین کی ڈائجسٹ نہ بنایا جائے جن میں جوش یا ترقی پسند شاعری کے بارے میں گھسے پٹے خیالات ہیں یا کمیونسٹ آئیڈیالاجی سے وابستگی کے مظہر ہیں۔ان مضامین میں یہ سکت ہوتی تو جوش کو کب کا مطلوبہ مقام دلا چکے ہوتے۔دوسرے اس قسم کے بلند وبانگ دعوے کہ وہ اقبال کے بعد سب سے اہم یا نظم کے سب سے بڑے شاعر ہیں ہوسکتا ہے پرستاران جوش کو اچھے لگیں لیکن جوش شناسی میں معاون نہیں۔ابھی ان کو فیض کی Hurdle پھلانگنے دیجئے تب منزل اقبال پر ان کی مسافت ناپی جائے گی۔اس لئے اگر جوش کے مطالعہ کو نیا آب ورنگ دینا ہے تو ان کی شاعری کا از سر نو مطالعہ غیر جانب دارانہ Objectivily طور پر کیا جائے جو محض ان کی تخلیق کے حوالے سے ہو،ان کے ترقی پسندی کے لگاؤ، کمیونسٹ آئیڈیالاجی Idiology سے وابستگی یا کسی فرقہ کی نسبت سے نہیں۔جوش کی تلاش نو کے لئے ضروری ہے کہ مطالعہ جوش میں تازہ کاری پیدا کی جائے کہ تیز وتند تازہ ہوا کے جھونکوں کے بغیر برسوں کے جمے خس وخاشاک ہٹنے سے۔

نہ ہو مایوس اس دل تیرگی عصر حاضر سے فروغ صبح فردا کے سب امکانات روشن ہیں

☆☆☆☆☆

سہارا تبصرہ

جوش کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اس سے تمام اہل نظر اتفاق کریں گے۔ ذی فہم اور غیر جانبدار اہل فکر متفق ہیں کہ جوش کو ان کی حیات میں جو مقام ملنا چاہئے تھا نہیں ملا۔ ورنہ یہ امر تب بھی مسلم تھا اور اب بھی ملحوظ خاطر ہے کہ جوش اور اقبال کا نظریۂ فکر و فن ایک سرزمین کی دو مختلف پیداوار ہے۔

یہ سچ ہے کہ وہ مصلحت کوشی کے بالکل قائل نہ تھے اور نہ ہی ان کا تعلق کسی خاص مکتبۂ فکر سے رہا جو کبھی نظیر اکبرآبادی کے ساتھ ہوا ویسا ہی کچھ جوش کے ساتھ بھی ہوا۔ انہوں نے ہمیشہ کسی فریم ورک اور ضابطے کی پابندی سے انحراف کیا اور فکر و فن کے باب میں لکیر کے فقیر نہیں رہے۔

زیر نظر مجلہ 'جوش بانی' جوش کی تلاش نو کا آغاز ہے۔ جوش شناسی سے متعارف کرانے کی غرض سے نامور و ناقد قمر رئیس اور اقبال حیدر کی یہ انتھک کوشش نہ صرف آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ ہے بلکہ جوش ملیح آبادی جیسے عظیم شاعر کے لیے خراج عقیدت بھی ہے۔ جوش لٹریری سوسائٹی، انڈیا و کینیڈا کے زیر اہتمام تحقیقاتی سلسلے کو آگے بڑھانے میں جن شخصیات نے بھی حصہ لیا ہے یقیناً قابل صد ستائش ہے۔

زیر نظر شمارہ، شخصیت، تنقید، تنقید نو اور تجزیوں پر مشتمل ہے۔ جن خاص شخصیات نے جوش ملیح آبادی کے فکر و فن اور ان کی شخصیات کا جائزہ لیا ہے ان میں چند نام قدرے اہم ہیں جنہیں عصری ادب اور عصری آگہی و رجحانات کا ماہر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ مثلاً مصطفیٰ زیدی، عبادت بریلوی، محمد علی صدیقی، نامی انصاری، اقبال حیدر، نفیس بانو، عزیزہ بانو، سید عقیل، بلال نقوی وغیرہ کے تحقیقاتی مضامین اس شمارے کی زینت ہیں۔ آخر میں سوال و جواب کے تحت مظہر امام، ابوالکلام قاسمی، عباس زیدی، شارب ردولوی جیسے عظیم ناقدین سے جوش ملیح آبادی کی شاعری و شخصیت کے تعلق سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں اور سب سے آخر میں جوش پر مبنی کتابوں پر تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔ بلاشبہ ان تبصروں کے ذریعے بھی جوش کے فکر و فن پر کافی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ مبصرین ہیں قمر رئیس، راجندر کمار، اکبر حیدری۔ امید ہے کہ 'جوش بانی' سے جوش فہمی کے نئے دروازے کھلیں گے اور جوش کی تخلیقی عظمتوں کے سراغ میں بھی اس سے مدد ملے گی۔ از سر نو جوش کی تلاش کا یہ عمل مبارک ہے اور اہل فکر کے لیے باعث مہمیز بھی کہ جن کا تخلیق کاروں کے ساتھ تنقید یا ادبی تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ ان کے تعلق سے بھی اسی طرح کے سلسلوں کی شروعات ہو، یہ جوش کے حوالے سے تمام فن کاروں کے حقیقی منصب کی تلاش و تعمیر کے جذبے کو جگانے کی ایک اچھی کوشش ہے۔

عاقل زیاد

جوش کی نذر

(جوش ملیح آبادی سے معذرت کے ساتھ)

انوار عباس

پس پردہ رُخِ فنکار رکھا جائے گا کب تک
مزاجِ وقت جانب دار رکھا جائے گا کب تک

فریبِ آگہی کے شعبدہ آرا اشارہ پر
اندھیرے میں تجلی زار رکھا جائے گا کب تک

دبا کر داستانِ زیست کے آوارہ صفحے کو
بہ وزن جبہ و دستار رکھا جائے گا کب تک

کسی دن جوہر خامہ کی رسوائی نہ ہو جائے
صحاب شوق دل آزار رکھا جائے گا کب تک

گزر گاہوں پہ خطّ کفر و ایماں کھینچنے والو
سفر مابین نور و نار رکھا جائے گا کب تک

خودی کا پوچھنے والا نہیں کوئی زمانے میں
خدا وندا مجھے خوددار رکھا جائے گا کب تک

کوئی انوارؔ جا کر اس کلیم شہر سے پوچھے
دوا دے کر مجھے بیمار رکھا جائے گا کب تک

☆☆☆

غالب انسٹی ٹیوٹ کا مجلّہ

غالب نامہ

مدیر: پروفیسر نذیر احمد

مدیران: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، شاہد ماہلی

"اُردو میں ادبی تحقیق اور تنقید کی رفتار کا آئینہ"

شمارہ	قیمت
پہلا اور دوسرا مشترکہ شمارہ	۲۰/روپے
پہلا اور دوسرا مشترکہ شمارہ	۱۰/روپے
جنوری ۱۹۸۱ء	۲۵/روپے
جولائی ۱۹۸۱ء	۳۰/روپے
جنوری ۱۹۸۲ء	۳۰/روپے
جولائی ۱۹۸۲ء	۳۵/روپے
جنوری ۱۹۸۳ء	۳۰/روپے
جولائی ۱۹۸۳ء	۳۰/روپے
جنوری ۱۹۸۴ء	۳۰/روپے
جولائی ۱۹۸۴ء	۳۰/روپے
جنوری ۱۹۸۵ء	۳۰/روپے
جولائی ۱۹۸۵ء	۳۰/روپے
جنوری ۱۹۸۶ء	۳۰/روپے
جولائی ۱۹۸۶ء	۳۰/روپے
جنوری ۱۹۹۷ء	۴۰/روپے
جولائی ۱۹۸۷ء	۳۰/روپے
جنوری ۱۹۸۸ء	۴۰/روپے
جولائی ۱۹۸۸ء	۴۰/روپے
جنوری ۱۹۸۹ء	۴۰/روپے
جولائی ۱۹۸۹ء، ۴۰/روپے	۴۰/روپے
جنوری ۱۹۹۰ء	۴۰/روپے
جولائی ۱۹۹۰ء (حافظ محمد شیرانی نمبر)	۴۰/روپے
جنوری ۱۹۹۱ء	۴۰/روپے
جولائی ۱۹۹۱ء	۴۰/روپے
جنوری ۱۹۹۲ء (عرشی نمبر)	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۹۲ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۳ء	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۹۳ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۴ء	۵۰/روپے

شمارہ	قیمت
جولائی ۱۹۹۴ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۵ء (سلور جوبلی نمبر ۱)	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۹۵ء (سلور جوبلی نمبر ۲)	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۶ء	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۹۶ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۷ء	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۹۷ء (احتشام حسین نمبر)	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۸ء	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۹۸ء	۶۰/روپے
جنوری ۱۹۹۹ء	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۹۹ء	۶۰/روپے
جنوری ۲۰۰۰ء	۶۰/روپے
جولائی ۲۰۰۰ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۲۰۰۱ء	۶۰/روپے
جولائی ۲۰۰۱ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۲۰۰۲ء	۶۰/روپے
جولائی ۲۰۰۲ء	۱۵۰/روپے
جنوری ۲۰۰۳ء	۶۰/روپے
جولائی ۲۰۰۳ء	۱۲۰/روپے
جنوری ۲۰۰۴ء	۶۰/روپے
جولائی ۲۰۰۴ء	۱۲۰/روپے
جنوری ۲۰۰۵ء	۱۵۰/روپے
جولائی ۲۰۰۵ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۲۰۰۶ء	۱۰۰/روپے
جولائی ۲۰۰۶ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۲۰۰۷ء	۱۰۰/روپے
جولائی ۲۰۰۷ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۲۰۰۸ء	۱۵۰/روپے
جولائی ۲۰۰۸ء	۱۰۰/روپے

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

मौलाना आजाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

(A National University established by an Act of Parliament in 1998)

Gachibowli, Hyderabad - 500 032

Ph. (EPABX) 040-23008402-04, Toll Free No. 1800-425-2958, websit e : www.manuu.ac.in

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Admission Notification (2008-09) اعلان برائے داخلہ ۲۰۰۸-۲۰۰۹

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو تعلیمی سال 2009-2008 کے لئے درج ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے کورسوں میں داخلے کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں:

پوسٹ گریجویٹ کورسس (دوسالہ)	انڈر گریجویٹ کورسس (تین سالہ)	ڈپلوما کورسس (ایک سالہ)	چھ ماہی سرٹی فیکیٹ کورسس
ایم.اے.اردو ایم.اے.تاریخ ایم.اے.انگلش	بی.اے. بی.کام بی.ایس.سی (B.Z.C. & M.P.C.) بی.ایڈ.B.Ed (دوسالہ)	ٹیچ انگلش (Teach English) جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن	اہلیت اردو بذریعہ انگریزی (PIU/English) اہلیت اردو بذریعہ ہندی (PIU/Hindi) فنکشنل انگلش (Functional English) غذا اور تغذیہ

پروسپیکٹس مع پروگرام گائیڈ 17 اگست 2008 سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد اور ریجنل سنٹرس حیدرآباد، دہلی، بھوپال، بنگلور، دربھنگہ، کولکتہ، ممبئی، رانچی، سری نگر، سب ریجنل سنٹر حیدرآباد، جموں، لکھنؤ، نوہ، سنبھل، امراوتی اور یونیورسٹی کے تمام اسٹڈی سنٹروں پر 17 اگست 2008 سے دستیاب رہیں گے۔ یہ فارمس یونیورسٹی ویب سائٹ (www.manuu.ac.in) سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے امیدوار جو انٹرمیڈیٹ (10+2) یا اس کے مماثل قابلیت نہیں رکھتے ان کے لئے 30 نومبر 2008 کو اہلیتی امتحان منعقد ہوگا۔ اہلیتی امتحان میں شرکت کرنے والے امیدواروں کے لئے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 30 اکتوبر 2008 ہے۔ پوسٹ گریجویٹ، انڈر گریجویٹ، ڈپلوما اور سرٹی فیکیٹ کورسس میں راست داخلے کی آخری تاریخ 31 جنوری 2009 ہے۔ انڈر گریجویٹ، ڈپلوما اور سرٹی فیکیٹ کورس کے لئے پروگرام گائیڈ شخصی طور پر -/200 روپے یا بذریعہ ڈاک -/250 روپے کے بینک ڈرافٹ کے عوض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بی.ایڈ پروگرام کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر -/500 روپے یا بذریعہ ڈاک -/550 روپے کے بینک ڈرافٹ کے ذریعے جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام حیدرآباد میں قابل ادا ہو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس پروگرام کی تواریخ، انٹرنس ٹسٹ کی تفصیلات پراسپکٹس میں دی گئی ہیں۔ پوسٹ گریجویشن، ڈپلوما اور سرٹی فیکیٹ کورسس کے لئے بینک ڈرافٹ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام حیدرآباد میں قابل ادا ہو، گریجویشن کورسس کے لئے بینک ڈرافٹ ریجنل ڈائریکٹر متعلقہ ریجنل سنٹر کے نام اور ریجنل سنٹر پر قابل ادا کسی بھی قومیائے بینک سے حاصل کردہ ہونا چاہئے۔ نقد رقم کسی بھی صورت میں قبول نہیں کی جائے گی۔ مزید تفصیلات یونیورسٹی ویب سائٹ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ریجنل سنٹروں کے پتے اور فون نمبر حسب ذیل ہیں۔

(1) Darbhanga Regional Centre, Super Market Building, Moula Ganj, Darbhanga - 846004 (Bihar). Tel. 0627-2221138 (2) Patna Regional Centre, 2nd Floor, Bihar State Co-operative Bank Building, Ashok Rajpath, Near B. N. College, Patna - 800004 (Bihar) Tel. 0612-2300413 (3) Delhi Regional Centre, B-1/275, Ground Floor, Zaidi Apartments, T.T.I.Road, Okhla, Jamia Nagar, New Delhi -25 Tel. 011-26934762, 011-26838260 (4) Srinagar Regional Centre, 18B, Jawahar Nagar, Opp BEECO Gallery, Srinagar - 190001 (J&K) Tel. 0194-2310221 (5) Ranchi Regional Centre, Near Millat Academy Campus, Tiwari Tank Road, Hindpiri, Ranchi - 834001 (Jharkhand) Mob. 9431623786 (6) Banglore Regional Centre, Room No. 8, 2nd Floor, Al-Ameen Commercial Complex, Hosur Road, Near Lal Bagh Main Gate, Bangalore - 27. Tel. 080-22228329 (7) Bhopal Regional Centre, 12 Ahmedabad Palace, Koh -E-Fiza, Bhopal-1 (Madhya Pradesh) Tel. 0755-2736930 (8) Mumbai Regional Centre, A-1, HS Ltd. F1/6, Flat No. 4, 2nd Floor, Above Ram Dev Hotel, Sector-5, Vashi, New Mumbai - 400703 Tel 022-27820511/515 (9) Kolkata Regional Centre, Flat No. 5, 2nd Floor, 9A, Lower Range, Kolkata - 17. (West Bengal) Tel. 033-22894568

کے. آر. اقبال احمد
ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم